اردو شاعری

BAUL-102

(دوسرا پرچہ) برائے بی–اے سال اول

Block- 1 to 4 (بلاک ۱ تا ۴)

Unit- 1 to 12 (اکائی ۱ تا ۱۲)

SCHOOL OF LANGUAGES
UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY, HALDWANI
(NAINITAL) -263139

اترا کھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی (نینی تال)

سر پرست اعلیٰ:

پروفیسر سبھاش دھولیا، وائس چانسلر، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

کمیٹی بورڈ آف اسٹڈیز:

پروفیسر ایچ۔ پی شکلا (ڈائرکٹر، اسکول آف لینگویجز UOU)

پروفیسر سید محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پروفیسر سید محمد نعمان، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، دہلی۔

ڈاکٹر اختر علی، اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر گرجا پانڈے، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈینیٹر و ایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر علی

اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

c جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت: جولائی 2013

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی کے درس نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لیے یونیورسٹی حکام یا کورس کوآرڈینیٹر سے یونیورسٹی کے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

Course Coordinator (urdu)

Uttarakhand Open University,Haldwani-263139(Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

(BAUL-102) (BA-12)

پیش لفظ

اترا کھنڈ اوپن یونیورسٹی کا قیام اترا کھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت 31 اکتوبر 2005 کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے ان لوگوں تک تعلیم کو پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب از خود کالجوں اور یونیورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی جن تعلیمی پروگراموں کی شروعات کی ہے ان میں سے ایک بیچلر آف آرٹ بھی شامل ہے۔ ''اردو ادب'' اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب بی۔اے سال اول (دوسرا پرچہ) کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ چار بلاکوں اور بارہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ اکائیاں دراصل الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقہ تعلیم کی کتابوں کو خود تدریسی مواد [Self Instructional Material(SIM)] کہا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اس مواد کو خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اسے پڑھانے کے لیے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا۔ آپ اس مواد کو خود ہی پڑھیں گے اور خود ہی سمجھیں گے۔ اس صورتحال کے تحت اسباق کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجود ہونے کا احساس ہو سکے اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی بہت حد تک دور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مربوط و مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان میں ''اپنے مطالعے کی جانچ کے سوالات'' بھی دیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ بھی پڑھا ہے اسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے' اس کا اندازہ لگا سکیں۔ ان سوالات کے جوابات آخر میں دیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود ہی جواب دیں اور جب جواب مکمل ہو جائے تب آخر میں دیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملا لیں۔ اس سے آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہوگی۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اس کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اکائیوں کے آخری حصے میں بعض کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ آپ ان کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہم آپ کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

فہرست

بلاک نمبر۱۔غزل

اکائی۱۔اردو غزل اور اس کی خصوصیات	پروفیسر شارب ردولوی
اکائی۲۔فانیؔ بدایونی	ڈاکٹر امتیاز احمد
اکائی۳۔آرزوؔ لکھنوی	ڈاکٹر پرویز احمد

بلاک نمبر۲۔غزل

اکائی۴۔مولانا حسرتؔ موہانی	پروفیسر افغان اللہ
اکائی۵۔فراقؔ گورکھپوری	پروفیسر افغان اللہ
اکائی۶۔ناصرؔ کاظمی	ڈاکٹر مشتاق صدف

بلاک نمبر۳۔نظم

اکائی۷۔نظم کی تعریف،بنیادی خصوصیات،ابتدا اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر کوثر مظہری
اکائی۸۔اخترؔ شیرانی۔'او دیس سے آنے والے بتا'	ڈاکٹر ثروت خان
اکائی۹۔اسرار الحق مجازؔ۔'آوارہ'	ڈاکٹر نکہت جہاں

بلاک نمبر۴۔نظم

اکائی۱۰۔علی سردار جعفری۔'ہاتھوں کا ترانہ'	پروفیسر علی احمد فاطمی
اکائی۱۱۔فیض احمد فیضؔ۔'صبح آزادی'(اگست ۱۹۴۷ء)	ڈاکٹر عزیزہ بانو
اکائی۱۲۔اختر الایمان۔'ایک لڑکا'	ڈاکٹر محمد آصف مظہری

بلاک نمبر 1

اکائی 1.	اُردو غزل اور اُس کی خصوصیات	9
اکائی 2.	فانیؔ بدایونی	30
اکائی 3.	آرزوؔ لکھنوی	46

اکائی 1 : اردو غزل اور اس کی خصوصیات

ساخت

1.1 اغراض و مقاصد

1.2 تمہید

1.3 غزل کی تعریف

1.4 غزل کے عناصر ترکیبی

1.4.1 مطلع　　1.4.2 حسن مطلع

1.4.3 قافیہ　　1.4.4 ردیف

1.4.5 تعداد اشعار　　1.4.6 مقطع

1.5 غزل کی بنیادی خصوصیات

1.6 غزل کی زبان

1.7 تشبیہ

1.8 استعارہ

1.9 کنایہ

1.10 صنائع شعری

1.10.1 صنعت تلمیح　　1.10.2 صنعت لف ونشر

1.10.3 صنعت مبالغہ　　1.10.4 صنعت ایہام

1.11 مضامین غزل

1.11.1 عاشقانہ　　1.11.2 زمانے کا شکوہ

1.11.3 ہستی کی ناپائیداری 1.11.4 صوفیانہ شاعری

1.12 خلاصہ

1.13 نمونہ امتحانی سوالات

1.14 فرہنگ

1.15 معاون کتابیں

1.16 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ اردو غزل اور اس کی خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ غزل کی تعریف۔ اس کے عناصر ترکیبی ۔ بنیادی خصوصیات۔ غزل کی زبان اور اس میں استعمال ہونے والی مختلف صنعتوں مثلاً تلمیح، لف ونشر۔ مبالغہ اور ایہام کے علاوہ مضامین غزل پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ زیرنظر اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اردو غزل اور اس کی بنیادی خصوصیات سے واقف ہو جائیں گے جس سے آپ کو عام زندگی میں بھی غزل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ جب غزل سمجھنے لگیں گے تو غزل کے تئیں آپ کی دلچسپی میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

1.2 تمہید

غزل اردو شاعری کی بہت اہم صنف سخن ہے۔ اردو شاعری میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری صنف کو نہیں ملی ۔ غزل کو پسند کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں اردو نہیں آتی۔ آپ کو غزل کی مقبولیت کا ایک قصہ سناتا ہوں۔ دو دوست رات کے وقت باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک دوست رک گیا۔ دوسرے دوست نے دریافت کیا، کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ غور سے سنو، کوئی غالبؔ کی غزل گا رہا ہے۔ دوسرے دوست نے کہا، ”غزل ہے تو واہ“ یعنی غزل ہر جگہ ہر صورت

میں قابل تعریف ہے اس طرح سبھی لوگ غزل کو پسند کرتے ہیں، کہیں مشاعرہ ہوتو ہزاروں کی تعداد میں لوگ غزلیں سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں، ساری ساری رات غزلیں سنتے اور اپنی پسند کے شعر لکھ کر لاتے ہیں اور دوستوں کو سناتے ہیں۔

1.3 غزل کی تعریف

غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی عورت یا محبوب سے باتیں کرنے کے ہیں لیکن ایک صنف کی حیثیت سے عرب کی پیداوار نہیں ہے۔ عرب میں یہ ایک دوسری صنف قصیدے کا جز تھی۔ قصیدے کے درمیان کبھی کبھی شعراء عاشقانہ اشعار شامل کر دیا کرتے تھے۔ ایران میں اسے قصیدے کے درمیان بھی کبھی کبھی شعراء عاشقانہ اشعار شامل کر دیا کرتے تھے۔ ایران میں اسے قصیدے سے الگ کر کے ایک علاحدہ صنف سخن کی حیثیت دی گئی اور ایک آزاد صنف سخن کی حیثیت سے اسے ایسی مقبولیت اور ترقی ملی کہ وہ قدیم اصناف سے آگے نکل گئی۔ فارسی شعراء نے بھی غزل کو بے حد فروغ دیا اردو میں غزل فارسی سے آئی اس لئے عام طور پر اس میں وہی عناصر ترکیبی اور صفات پائی جاتی ہیں جو فارسی غزل میں ملتی ہیں۔ غزل صرف معاملات عشق تک محدود نہیں رہی اس کا دامن رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیااور زندگی کے مختلف مسائل اس میں جگہ بناتے گئے۔

1.4 غزل کے عناصر ترکیبی

غزل کے عناصر ترکیبی، ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن سے مل کر غزل بنی ہے یا یوں کہیں کہ جو غزل کی پہچان ہیں اور جن کی کمی سے غزل مکمل نہیں کہلاتی۔

1.4.1 مطلع

مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں۔ لیکن غزل کا پہلا شعر ہی مطلع نہیں کہلاتا بلکہ مطلع کے لئے

ضروری ہے کہ اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہو اور اگر مردف غزل ہے تو دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف دونوں ہوں ۔

1.4.2 حسن مطلع

کسی غزل میں دو مطلع یا ایک سے زائد مطلع ہوں تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں ۔غزل میں مطلعوں کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ایک سے زائد مطلع بھی ہو سکتے ہیں لیکن عام طور پر ایک ہی مطلع ہوتا ہے ۔اب آپ سوال کریں گے کہ قافیہ اور ردیف کیا ہے یہ سوال ذہن میں آنا فطری بات ہے۔

1.4.3 قافیہ

قافیہ کے لئے آسان لفظ 'تک' ہے ۔آپ اکثر کسی بات پر کہتے ہیں،کیا تک بٹھائی ہے ۔یعنی ایک طرح کے الفاظ لانا جسے پیمانہ، افسانہ، دیوانہ، یا شام ،آرام ، نام ، دام وغیرہ یہ قافیہ ہیں اس طرح شاعر کسی بھی لفظ کو قافیہ بنا سکتا ہے مثلاً درج ذیل مطلع میں اعتبار اور انتظار قافیہ ہیں :

غضب کیا تیرے وعدے کا اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

(داغؔ)

1.4.4 ردیف

ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا مجموعہ ہے جو غزل کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر میں لایا جائے۔ردیف کے طور پر کسی بھی لفظ کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن پوری غزل میں اس کی پابندی لازمی ہوگی ۔مثلاً غالبؔ کی غزل کا مطلع ہے :

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اور میرؔ کے شعر کا مطلع ہے:

ہوگئی شہر شہر رسوائی اے میری موت تو بھلی آئی

پہلے مطلع میں ’ہوا‘ اور ’دوا‘ قافیہ ہیں اور ’’کیا ہے‘‘ ردیف ہے۔ دوسرا مطلع غیر مردف ہے یعنی اس میں ردیف کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ رسوائی اور آئی اس میں قوافی ہیں۔

1.4.5 تعداد اشعار

غزل میں تعداد اشعار کی کوئی قید نہیں ہے لیکن عام طور پر غزل میں طاق اشعار ہوتے ہیں جیسے 7، 9 یا 11 اشعار۔ اس سے زیادہ اشعار کی غزلیں بھی شعراء نے لکھی ہیں عام رواج مختصر غزلوں کا ہے۔ فراقؔ گورکھپوری ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے طویل غزلیں لکھی ہیں۔

1.4.6 مقطع

غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ مقطع کو نظم کرنے میں شعراء نے اپنے تخلص سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ مومنؔ کا مقطع ہے:

دشمن مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا
(مومنؔ)

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا
(میر تقی میرؔ)

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(محمد رفیع سوداؔ)

اس طرح غزل کا آخری شعر اگر شاعر نے اس میں تخلص نظم کیا ہے تو مقطع کہلائے گا۔

1.5 غزل کی بنیادی خصوصیات

ابھی ہم غزل کے عناصر ترکیبی کا ذکر کر رہے تھے۔ در اصل غزل کی خصوصیات یا شناخت کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اول ظاہری صورت جس میں قافیہ، ردیف مطلع، حسن مطلع اور مقطع وغیرہ ہے۔ دوسرے اس کی اندرونی ہیئت یعنی اس کے مضامین، اس کی زبان، اس کی تشبیہات اور استعارے جو غزل کو غزل بناتے ہیں۔ غزل کے مضامین کے سلسلے میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ اس میں پیار و محبت یا معاملات عشق کا ذکر زیادہ ہوتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر فراقؔ گورکھپوری کی بھی یہی رائے ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"غزل کے اشعار معاملات حسن عشق پر زیادہ مشتمل ہوتے ہیں۔"

(فراقؔ گورکھپوری بحوالہ اردو شاعری کا فنی ارتقاء۔ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ صفحہ ۱۳)

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ غزل میں صرف معاملات حسن و عشق ہی ہوتے ہیں۔ اصل میں غزل کی زبان کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ غزل میں ساری باتیں براہ راست نہیں کہی جاتیں غزل کا حسن ہی اس کی رمزیت اور ایمائیت میں ہے۔ اس میں استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً شمع، پروانہ، محفل، ساقی، گلشن، بہار، اسیری، قفس، عاشقانہ مفہوم کے الفاظ لگتے ہیں لیکن اکثر شاعران کے پردے میں کچھ اور ہی کہتا ہے۔

غزل کی بنیادی خصوصیات میں اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے یعنی غزل میں اگر پانچ یا سات اشعار ہیں تو وہ اپنے معنی میں ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے مثلاً میرؔ کی یہ غزل دیکھئے:

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا　　جھانکنا، تاکنا، کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل ایک　　سر سے سودا کے جستجو نہ گیا
لب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں　　لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے تھے مسودے لیکن ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میؔر ہم تو رہے

دست کوتاہ تک سبو نہ گیا

میر تقی میؔر کی اس غزل کو آپ پڑھیں اور غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس کا ہر شعر معنی کے اعتبار سے الگ ہے۔ بعض ناقدین نے غزل پر اسی لئے اعتراض کیا کہ اس کے اشعار میں ربط نہیں ہوتا ان اعتراضات کرنے والوں میں ایک بہت بڑا نام کلیم الدین احمد کا ہے جن کا خیال ہے کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ بعض شعراء نے ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں جن کے اشعار میں موضوع یا معنی کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں کو غزل مسلسل بھی کہتے ہیں لیکن ایسی مثالیں عام نہیں ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. غزل کے کیا معنی ہیں؟
2. حسن مطلع سے کیا مراد ہے؟
3. غزل کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟

1.6 غزل کی زبان

اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ غزل میں گفتگو اشارے اور کنائے میں کی جاتی ہے۔ جس کا مقصد اظہار کو پر اثر اور دلکش بنانا ہوتا ہے۔ زبان میں اس خوبصورتی کو پیدا کرنے کے لئے شاعروں نے تشبیہ، استعارہ اور کنایہ وغیرہ سے کام لیا۔ جس سے زبان کی خوبصورتی کے ساتھ معنی میں بھی نئے نئے پہلو پیدا ہوئے۔ غزل اگر ایک طرف بہت آسان صاف اور سادہ زبان میں ملتی ہے تو دوسری طرف تشبیہ استعارے سے آراستہ زبان ہے جس نے غزل کو ہر خاص و عام میں مقبول بنایا ہے۔

مثلاً یہ شعر دیکھیں ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یا اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

یہ اشعار زبان کی سادگی کی اپنی آپ مثال ہیں۔ اسی طرح شعراء نے غزل میں زمانے کے حالات اور انتشار کو بہت سادہ لیکن پر اثر انداز میں پیش کیا ہے جس سے غزل کی زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً میرؔ کا شعر ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

یا میر انیسؔ کا شعر ہے ؎

بازار بند ہوگئے جھنڈے اکھڑ گئے فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے

ان اشعار میں دونوں شاعروں نے اپنے عہد کے سیاسی نظام اور بدنظمی کو پیش کیا ہے اس طرح کے اور بھی اشعار مثال میں دئے جا سکتے ہیں جن میں کسی استعارے اور کنائے کے بجائے واقعے کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہو غزل کا لطف اور اس کا حسن اس کی تشبیہات استعارے اور صنائع میں پوشیدہ ہے۔ غزل کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ بڑی سے بڑی بات اشاروں میں کہہ دی جاتی ہے۔ غزل میں یہ کام شاعر تشبیہ، استعارے اور صنعتوں سے لیتا ہے۔ اسی لئے رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ”غزل اردو شاعری کی آبرو ہے“۔

1.7 تشبیہ

تشبیہ ایک عام لفظ ہے۔ انگریزی میں اسے ”simile“ اور ہندی میں ”اپما“ کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کے بارے میں کسی دوسری چیز کے ذریعے مثال دینا یا مشابہت تلاش کرنا۔ میرؔ کا شعر ہے ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں میرؔ نے محبوب کے ہونٹوں کی نزاکت کی مثال گلاب کی پنکھڑی سے دی ہے ۔ اسی مشابہت کو تشبیہ کہتے ہیں۔ اس تشبیہ نے شعر کا لطف دو بالا کر دیا ہے ۔ تشبیہ کی چند اور مثالیں دیکھئے ۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا
(ولیؔ دکنی)

امڈی آتی ہیں آج بھی آنکھیں
جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں
(میرؔ)

نام بھی لینا ہے جس کا اک جہان رنگ و بو
دوستوں اس نو بہار ناز کی باتیں کرو
(فراقؔ گورکھپوری)

1.8 استعارہ

استعارہ بھی تشبیہ کی طرح شعر کی دلکشی اور اس کے تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔ استعارے کے معنی 'مستعار' لینے یا مانگ کر لینے کے ہیں۔ یعنی اس میں کسی کی صفات کو مستعار لیا جاتا ہے۔ استعارے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شعر میں تہہ داری اور معنی میں وسعت پیدا کرتا ہے ۔ تشبیہ میں ایک چیز سے دوسری چیز کی مثال دی جاتی ہے جب کہ ہر استعارے میں صفت کی بنا پر اس کو وہی چیز ٹھہرایا جاتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جائے گا کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کی مشابہت دکھائی جاتی ہے اور استعارے میں مشابہت کے بجائے مشبہ کو خود ہی مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے اور انھیں مستعارلہ اور مستعار منہ کہتے ہیں۔ نثر میں اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ کسی کی بہادری کے بارے میں اگر کہا جائے کہ'' اکبر شیر ہے'' تو

یہاں پر اکبر مستعار لہ ہے اور شیر جیسے استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا مستعار منہ ہے۔ مثلاً ؎

ہیں یاد وہ بے مثال آنکھیں　　کیا ہیں وہ تیری غزال آنکھیں

اس شعر میں محبوب کے لئے غزال کا لفظ استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی چند اور مثالیں درج ذیل ہیں:

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشت باغ کو　　کچھ رنگ و بوئے گل کے عیوض ہے صبا کے ساتھ
(مومنؔ)

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
(غالبؔ)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے　　جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
(ثاقبؔ لکھنوی)

تشبیہ اور استعارے کی بہت سی قسمیں ہیں یہاں پر صرف استعارے کے بنیادی مفہوم کو پیش کیا گیا ہے۔ شعراء نے عام طور پر جن الفاظ کو استعاروں کے طور پر استعمال کیا ہے ان میں کچھ مخصوص طرح کے الفاظ ہیں جنھیں کئی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً چمن یا باغ سے متعلق استعارے: جس میں، گلشن، بہار، غنچہ، خزاں، سرو بلبل، گلچیں، صیاد، سبزہ، شبنم وغیرہ شامل ہیں۔ بعض استعاروں کا تعلق میکدے سے ہے مثلاً شراب، ساقی، میخانہ، جام، شیشہ، سبو، ساغر اور اسی طرح بعض دوسرے موضوعات سے متعلق استعارے ملتے ہیں۔ جیسے: بزم، شمع، پروانہ، چراغ، قفس وغیرہ۔

1.9 کنایہ

اشارے میں کسی بات کے کرنے کو کنایہ کہتے ہیں۔ یہ بھی تشبیہ و استعارے کی طرح شعر کے معنی کو وسعت دیتا ہے اور اس کو دلکش و خوبصورت بناتا ہے۔ کنایہ در اصل وہ لفظ یا الفاظ ہیں جن سے ان کے

اصل معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن اس کا خاص لطف غیر حقیقی معنی میں ہی آتا ہے۔ مختصر الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کنایہ چھپے ہوئے معنی یا پوشیدہ بات کی طرف اشارہ ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ۔

صبح آیا جانب مشرق نظر
وہ نگار آتشیں رخ سر کھلا
(غالبؔ)

یہاں پر غالبؔ نے " نگار آتشیں رخ " سے سورج مراد لیا ہے یعنی یہ کنایہ ہے سورج کا جو صبح مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔ آتشؔ کا شعر ہے ۔

گیسوؤں کا ترے سودا شعراء رکھتے ہیں
یہی باعث ہے جو فکر رسا رکھتے ہیں
(آتشؔ)

شعراء نے ہمیشہ محبوب کی زلفوں کی لمبائی کا ذکر کیا ہے یہاں آتش اسے فکر رسا کے کنائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کنائے کی چند اور مثالیں درج ذیل ہیں ۔

تصویر کھینچی اس نے رخ سرخ فام کی
اک صفحہ میں قلم نے، گلستاں تمام کی
(آتشؔ)

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
(میرؔ)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. تشبیہ کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ لکھیے۔

5. استعارے کی تعریف لکھئے؟ اور اس کی مثال دیجیے۔

6. کسی شعر میں کنایہ کی نشاندہی کیجیے۔

1.10 صنائع شعری

صنائع شعری کا استعمال شعر کی معنوی وسعت اور دلکشی کے لئے کیا جاتا ہے صنائع شعری کی بہت سی قسمیں ہیں اور شعراء نے ان کے استعمال میں فنکاری کے ایسے جوہر دکھائے ہیں جو کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملیں گے۔ صنائع دو طرح کے ہوتے ہیں ایک صنائع لفظی اور دوسرے معنوی۔ صنائع لفظی الفاظ کے استعمال سے متعلق ہے مثلاً ہم معنی الفاظ کا استعمال جیسے صبا اور سبا یا ذومعنی الفاظ کا استعمال جیسے چارہ گر اور چارہ، جیسے اور جینے وغیرہ۔ شعراء نے زبان اور الفاظ کے استعمال میں ہمیشہ نئے نئے گوشے پیدا کئے ہیں جس کی بہت اچھی مثالیں صنائع معنوی میں نظر آتی ہیں۔ صنائع معنوی کا تعلق معنوی خوبیوں سے ہوتا ہے جس میں شاعر الفاظ کے استعمال سے نئے معنوی نکات پیدا کرتا ہے۔ یہاں پر تعارف کے طور پر چند صنائع کی مثالیں درج ذیل ہیں:

1.10.1 صنعت تلمیح

صنعت تلمیح اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں کسی مشہور واقعہ، شخص یا کردار کی طرف اشارہ ہو۔ تلمیح کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک لفظ سے پورا واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً غالبؔ کا مشہور شعر ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ابن مریم حضرت عیسیٰؑ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جنھیں خدا نے معجزہ عطا کیا تھا کہ وہ بیماروں کو اچھا اور مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے۔ اس شعر میں غالبؔ ان کی اسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس صنعت

سے شعراء نے طرح طرح سے فائدہ اٹھایا ہے اور بعض شعراء نے اپنے عہد کے حالات کو پیش کرنے کے لئے تلمیح کا سہارا لیا ہے مثلاً اقبالؔ کا شعر ہے ۔

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

اس شعر میں ابراہیمؑ اور نمرود تلمیح کے الفاظ ہیں جو اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ نمرود نے دہکتی ہوئی آگ میں حضرت ابراہیمؑ کو ڈلوا دیا تھا۔ اقبالؔ اس واقعے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ آج پھر وہی صورت ہے کہ اولاد ابراہیمؑ کو نمرود جیسے ظالم وجابر حکمراں کا سامنا ہے ۔ کیا خدا حضرت ابراہیمؑ کا بھی امتحان لینا چاہتا ہے؟

1.10.2 صنعت لف ونشر

لف ونشر کے معنی پھیلانے کے ہیں ، اس میں شاعر اپنے مقصد کو بیان کرنے کے لئے ترتیب سے کئی چیزوں کا ذکر کرتا ہے اور دوسرے مصرعے میں اسی سے متعلق باتوں کو ترتیب سے بیان کرتا ہے مثلاً ۔

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار

گل جدا سرو جدا، نرگس بیمار جدا

اس شعر میں رخسار کے تعلق سے گل، قد کے تعلق سے سرو اور چشم کے تعلق سے نرگس بیمار کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں ایک معنوی ربط بھی ہے دوسرے یہ لف ونشر کے ساتھ استعارے کا لطف بھی دیتے ہیں ۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے ۔

ابرو نے مژہ نے نگہ یار نے یاور

بے رتبہ کیا تیغ کو خنجر کو سناں کو

(سوداؔ)

1.10.3 صنعت مبالغہ

کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کو مبالغہ کہتے ہیں ، اردو اصناف سخن میں مبالغہ کو سب سے زیادہ قصیدے میں جگہ ملی ۔شاعری میں ایک صنعت ضرور ہے لیکن اگر مبالغہ حد سے بڑھ جائے تو ذہن اس کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ شاعر کی شعری مہارت اور زبان پر اس کی قدرت کا اندازہ اس کی مبالغہ آرائی سے ہوتا ہے ۔سوداؔ کا ایک شعر ہے ۔

جوش روئیدگی سبزہ سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاو زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

سوداؔ کہتے ہیں کہ بہار کا ایسا جوش ہے کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے ۔ سبزے کی روئیدگی کی اس شدت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کہیں اس گائے کی سنگ میں بھی کونپل نہ نکل آئے جس پر یہ دنیا ٹکی ہے اس میں زبان پر قدرت اور لطف بھی ہے لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اب ایک شعر ایسا دیکھئے جس میں مبالغہ تو ہے لیکن ذہن اسے گرمی کی شدت کی تصویر کشی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے ۔

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
(میر انیسؔ)

میر انیسؔ نے اس شعر میں مبالغے کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ وہ مبالغہ نہیں محسوس ہوتا ہے۔

1.10.4 ایہام

ایہام کے معنی دھو کے میں ڈالنا ہے ۔ یعنی ایسے لفظ کا استعمال جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے معنی اور ایک دور کے یعنی چھپے ہوئے معنی اور شاعر چھپے ہوئے معنی مراد لے ۔ ایک زمانے میں یہ صنعت بہت مقبول تھی لیکن بعد کے شعراء نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ۔لیکن اس کے باوجود اس کی مثالیں اکثر شعراء کے یہاں مل جاتی ہیں۔ دیا شنکر نسیمؔ کا شعر ہے ۔

میکش کو ہوس ایاغ کی ہے پروانے کو لو چراغ کی ہے

'لو' کے معنی 'شعلے' کے ہیں ۔ شمع کی لو، چراغ کی لو ہم برابر استعمال کرتے ہیں لیکن لو کے ایک معنی محبت اور آرزو کے بھی ہیں جیسے کہتے ہیں اسے اللہ لے لو لگی ہے ۔ لو لگنا یعنی کسی کی محبت میں گرفتار ہونا۔ یہاں پر شاعری کی مراد پروانے کی چراغ سے محبت ہے ۔ جس محبت میں چراغ پر قربان ہو جاتا ہے ۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. تلمیح کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ لکھیے ۔

8. صنعت لف ونشر کی مثال دیجیے۔

9. ایہام کے کیا معنی ہیں ؟

1.11 مضامین غزل

غزل کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کا شمار کرنا ممکن نہیں ہے شاعری یا ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے ۔ اس لئے زندگی کے بیشتر موضوعات پر غزل میں اشعار مل جاتے ہیں موضوعات یا مضامین کی تفہیم کے لئے انھیں چند خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تقسیم نامکمل ہی کہلائے گی۔ یہاں پر غزل کے کچھ خاص مضامین/ موضوعات کی مثالیں درج ذیل ہیں :

1.11.1 عاشقانہ

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے
(میر تقی میرؔ)

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(مرزا محمد رفیع سوداؔ)

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آن ہے جوتم کو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم
(شادؔ عظیم آبادی)

کس نے بھیگی ہوئی زلفوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
(آرزوؔ لکھنوی)

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
(فیض احمد فیضؔ)

1.11.2 زمانے کی شکایت

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
(میر دردؔ)

آیا جو اس جہاں میں سو برباد ہی گیا
نے جام جم نہ تخت سلیمان رہ گیا
(مصحفیؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(خواجہ میر دردؔ)

1.11.3 ہستی کی ناپائیداری

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
(میر تقی میرؔ)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
(غالبؔ)

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے
(میر انیسؔ)

دارِ فانی میں یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے فانیؔ
زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے
(فانیؔ بدایونی)

1.11.4 صوفیانہ شاعری

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا
(میر دردؔ)

نہ جا کعبہ نہ بت خانہ جو آنا ہو تو دل میں آ
کہیں اللہ کا جلوہ ہیں اور ہے، تو اس گھر میں
(شادؔ عظیم آبادی)

دل ہر قطرہ ہے ساز انا لجبر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
(غالبؔ)

1.12 خلاصہ

اس اکائی میں غزل کے بارے میں بیشتر اہم باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے، اس میں غزل کی تعریف، اس کے عناصر ترکیبی، غزل کی بنیادی خصوصیات، اس کی زبان، صنائع اور مضامین غزل سے بحث کی گئی ہے۔ جہاں تک غزل کے خصوصیات یا مضامین کا تعلق ہے۔وہ زندگی کے مسائل وموضوعات کی طرح بے حساب ہیں۔ ہمارے احساس، جذبات اور مشاہدے کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہوگا جس پر ہمیں غزل کے اشعار نہ مل جائیں لیکن اس اکائی میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ زبان یا اس سے متعلق صنائع کے اہم نکات سے واقفیت ہو سکے۔ اسی لیے ان صنائع اور تشبیہ واستعارے کی تعریف وتشریح کر دی گئی ہے۔ جو بار بار غزل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

1.13 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب10-10 سطروں میں دیجیے:

1. غزل کی تعریف لکھئے اور اس کے عناصر ترکیبی پر روشنی ڈالیے۔
2. غزل کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. غزل کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب30-30 سطروں میں دیجیے:

1. حسن مطلع کسے کہتے ہیں؟
2. تشبیہ یا استعارے کی تعریف مع مثال کے لکھیے۔
3. صنعت تلمیح کی تعریف مع مثال کے تحریر کیجئے۔

1.14 فرہنگ

صنعت	شاعری کی قسم
سخن	شاعری

فروغ	ترقی
صفات	خوبیاں (صفت کی جمع)
عناصر	جزو
ہیئت	شکل
طاق	وہ عدد جو اکیلا ہو جیسے ۳ ، ۵، ۷ وغیرہ
مشتمل	شامل
رمزیت	چھپا کر ، گھما پھرا کر
ایمائیت	اشاروں اشاروں میں
نکو	حسین ، خوبصورت
سبحہ	تسبیح
ناقدین	تنقید کرنے والے
کوتاہ	چھوٹا
مرقع	تصویر
مشبہ	جس چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دی جائے جیسے ''محبوب کے لب''
مشبہ بہ	جس چیز سے تشبیہ دی جائے جیسے '' گلاب کی پنکھڑی''
مشابہت	ایک جیسا ہونا
اصطلاح	عام معنی کے علاوہ کوئی اور معنی
مستعار لہ	جس کے لئے کوئی استعارہ لایا جائے جیسے 'محبوب'
مستعار منہ	جس چیز کو استعارے کے طور پر استعمال کیا جائے جیسے 'غزال'

سبو	گھڑا، ٹھہرانا، مٹکا
ابہام	مبہم، جس کے معنی نہ سمجھ میں آئیں
روئیدگی	پیدا ہونا، اگنا
طویل	لمبی
مقطع	غزل کا آخری شعر
درماں	علاج
تیغ	تلوار
سناں	برچھی

1.15 معاون کتابیں

1. غزل اور مطالعۂ غزل — عبادت بریلوی
2. اردو ادب کے پچاس سال — عبدالاحد خاں خلیل
3. اردو غزل — یوسف حسین خاں
4. درس بلاغت — ترقی اردو بورڈ
5. اردو غزل — ڈاکٹر کامل قریشی

1.16 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی عورت یا محبوب سے باتیں کرنے کے ہیں۔
2. کسی غزل میں دو مطلع یا ایک سے زائد مطلع ہوں تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔
3. غزل کے عناصر ترکیبی ہیں۔ مطلع، حسن مطلع، قافیہ، ردیف، تعداد اشعار، مقطع۔
4. کسی چیز کے بارے میں کسی دوسری چیز کے ذریعے مثال دینا یا مشا بہت تلاش کرنے کو

تشبیہ کہتے ہیں ۔مثلاً ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

5. استعارے کے معنی ' مستعار' لینے یا مانگ لینے کے ہیں یعنی اس میں کسی کی صفات کو مستعار لیاجاتا ہے اصطلاحی الفاظ میں کہا جائے گا کہ استعارے میں مشابہت کے بجائے مشبہ کو خود ہی مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے اورانھیں مستعار لہ اور مستعار منہ کہتے ہیں۔مثلاً ؎

ہیں یاد وہ بے مثال آنکھیں　　کیا ہیں وہ تری غزال آنکھیں

6. صبح آیا جانب مشرق نظر　　وہ نگار آتشیں رخ سر کھلا　(غالبؔ)

یہاں پر غالبؔ نے " نگار آتشیں رخ " سے سورج مراد لیا ہے یعنی یہ کنایہ ہے سورج کا جو صبح مشرق سے نمودار ہوتا ہے۔

7. کسی مشہور واقعہ، شخص یا کردار کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں مثلاً ؎

آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے　　کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے　(اقبالؔ)

8. صنعت لف ونشر کی مثال ؎

ابرو نے مژہ نے نگہ یار نے یارو　　بے رتبہ کیا تیغ کو خنجر کو سناں کو

9. ایہام کے معنی دھوکے میں ڈالنا ہے ۔یعنی شعر میں ایسے لفظ کا استعمال جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے معنی اور ایک دور کے یعنی چھپے ہوئے معنی اور شاعر چھپے ہوئے معنی مراد لے۔

اکائی 2 : فانؔی بدایونی

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 حیات

2.4 فانؔی کی شاعرانہ خصوصیات

2.4.1 مخصوص تراکیب

2.4.2 فکری آہنگ

2.4.3 ڈرامائیت

2.4.4 قول محال

2.4.5 صوتی حسن

2.5 فانی کی غزل (1)

2.5.1 غزل کا مجموعی تاثر

2.5.2 اشعار کی تشریح

2.6 فانؔی کی غزل (2)

2.6.1 غزل کا مجموعی تاثر

2.6.2 اشعار کی تشریح

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو فانؔی بدایونی کی حیات وخدمات اور شاعری سے واقف کرانا ہے۔اس سلسلہ میں اُن کی زندگی کے بارے میں آپ کو بعض بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں تا کہ ان کی شاعری کا صحیح پس منظر فراہم ہو سکے۔پھران کی شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔اوران کی دوغزلوں کی تشریح کی گئی ہے تا کہ ان کی شاعری کی تفہیم میں آسانی ہو۔

2.2 تمہید

غالبؔ کے بعد اُردو غزل کا جو دور شروع ہوا اُس میں امیؔر مینائی، نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی، جلال اور اسیؔر کے بعد کی نسل میں سب سے ممتاز شعرا جوشؔ اور اقبالؔ ہیں۔تاہم اس نسل میں اصغؔر، جگرؔ، حسرؔت اور فانؔی نے لگ بھگ ایک ساتھ اپنی علاحدہ پہچان بنائی۔ 1893ء میں حالؔی کی کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' کی اشاعت اور 1874ء میں انجمن پنجاب کے ذریعے مناظموں کی ابتدا کے بعد سے اُردو میں نظم نگاری کا جو دور شروع ہوا اس میں غزل کی صنف سب سے زیادہ معتوب ہوئی۔غزل کی صنف کے لیے اس ناموافق فضا اور ماحول میں اصغؔر، جگرؔ، حسرؔت، فانؔی اور فراقؔ نے اپنی آواز بلند کی۔اور ایک بار پھر غزل کا لوہا منوایا۔اس پورے گروپ میں فانؔی کی آواز خاص طور سے بہت غمگین ہے۔بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:

> ''فانی کے یہاں آلام حیات کی تفسیر ہے۔فانی زندگی کو ایک مسلسل اور منظم الم قرار دیتے ہیں۔وہ الم جس نے بدھ کو نجات کا متلاشی بنایا اور جس کی نشاندہی مسیح کی صلیب کرتی ہے۔''

2.3 حیات

شوکت علی فانی بدایونی 13 ستمبر 1879ء کو بدایوں کے قصبہ اسلام نگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم بدایوں

میں ہی حاصل کی۔ 1897ء میں بدایوں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1901ء میں بریلی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے میں انگریزی ادب کے ساتھ فلسفہ کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ ابتدائی زمانہ میں ہی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ 1903ء میں انجمن اُردوئے معلیٰ علی گڑھ کی دعوت پر میر مہدی مجروحؔ کی صدارت میں منعقد ایک شعری نشست میں اپنی غزل پڑھی جو بہت مقبول ہوئی۔ 1906ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا اور 1908ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر لی۔ لکھنؤ جا کر وکالت شروع کی اور خاصے کامیاب رہے۔ 1913ء میں جب بدایوں میں سیشن کورٹ قائم ہوا تو اُنہوں نے اپنی پریکٹس یہاں منتقل کر لی۔ 1917ء میں والد کے انتقال کے بعد وہ پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ اس بار انہوں نے وکالت سے زیادہ توجہ اپنی شاعری پر دی۔ اس لیے شعری فتوحات کے باوجود مالی اعتبار سے اُن کی حالت کمزور ہو گئی۔ وکالت میں ناکامی اور کمزور مالی حالت کی وجہ سے انہیں ایک بار پھر بدایوں واپس آنا پڑا۔ یہاں سے بریلی، لکھنؤ اور اٹاوہ ہوتے ہوئے وہ حیدرآباد اور پھر آگرہ پہنچے۔ لیکن یہاں بھی ان کی شومی قسمت نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وکالت میں ناکامی کے بعد یہیں سے اُنہوں نے ایک ادبی رسالہ ''تسنیم'' کے نام سے جاری کیا۔ لیکن جلد ہی اس میں بھی خسارہ ہونے لگا اور اسے مانی جائسی کے سپرد کر کے الگ ہو گئے۔ اسی دوران مہاراجہ سر کشن پرشاد کی دعوت پر وہ حیدرآباد چلے گئے جہاں کافی کوشش کے بعد انہیں صدر مدرسی کی ملازمت مل گئی۔ لیکن یہ ملازمت بھی زیادہ دنوں نہ رہی اور ان کے سرپرست مہاراجہ کشن پرشاد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں خاصے دشوار گزار حالات سے گزرتے ہوئے 27 اگست 1941ء کو فانی کا انتقال ہو گیا۔

فانی ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خاصی فارغ البال زندگی کے عادی تھے اسی لیے اکثر تنگ دست رہے۔ بقول آل احمد سرور:

''فانی کے یہاں شروع سے اپنی نسلی برتری کا احساس ہے اور دولت کے سمٹتے ہوئے دائرے میں دھومیں مچانے کا بھی۔ فانی کی شخصیت میں شروع ہی سے ایک بات خاصی نمایاں ہے۔ ان کے شاعرانہ مزاج نے اُن کی شخصیت پر اس طرح حکمرانی کی کہ وہ صرف شاعر، ہمہ وقت شاعر ہو کر رہ گئے......... فانی مہذب آدمی تھے۔ اُن کے دوستوں کا ایک

مخصوص حلقہ بھی تھا مگر وہ زیادہ بے تکلف کسی سے نہ ہوتے تھے۔ اُنہیں ٹھاٹھ سے رہنے اور خرچ کرنے کا شوق تھا مگر اس کے لیے وہ کوئی جتن نہیں کر سکتے تھے۔ شاعری کو زندگی سمجھنے کے بعد وہ زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی ان کی محرومیوں اور ناکامیوں کی وجہ بھی ہے اور یہی ان کی شخصیت کے کھرے پن اور اس کھرے پن میں ایک بانکپن کا راز ہے۔"

فانی نے 1890ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اُن کے درج ذیل چار شعری مجموعے شائع ہوئے:

1. دیوان فانی 1921ء
2. باقیات فانی 1922ء
3. عرفانیات فانی 1938ء اور
4. وجدانیات فانی 1940ء

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے :

1. فانی کا پورا نام بتائیے۔
2. فانی کس سن میں پیدا ہوئے؟
3. فانی کی تاریخ وفات کیا ہے؟
4. فانی نے آگرے سے کون سا رسالہ جاری کیا؟
5. فانی کے دو معاصرین کے نام بتائیے۔
6. فانی کے دو شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔
7. فانی کس پیشے سے وابستہ تھے؟

2.4 فانی کی شاعرانہ خصوصیات

2.4.1 مخصوص تراکیب

فانی کی شاعری پر غور کریں تو سب سے پہلے جو چیز ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کی مخصوص تراکیب ہیں۔ ان تراکیب سے جہاں ایک طرف زبان کے سرمایے میں اضافہ ہوتا ہے وہیں یہ ان کی شاعری میں ایک طرح کا

اور فلسفیانہ گہرائی بھی پیدا کرتی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ فانی کی شاعری میں استعمال ہونے sophistication والی ان تراکیب کی تعداد دس بیس یا چالیس پچاس نہیں بلکہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے ایک مطالعے کے مطابق یہ تعداد تین سو کے آس پاس ہے۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

یوسف کنعان تمنا، ہدیۂ مژگاں، ہجوم ناز، وضع اضطراب، وضع خود پسندی، نگاہ غم نواز، نشاط جنوں، نقاد سوز دل، نمک پاش جراحت ہائے دل، ناسازگاریٔ غم، نامراد اجل، شق خوئے تغافل، مآل سوز غم ہائے نہانی، محروم صد تماشا، مرگ ناگہاں انجام، ماتم کدۂ وفا، فنا آباد غم، فریب سادگی، فرصت رنج اسیری، عیش خواب لحد، عیش غم انجام، شعلہ خس پوش، شہید غم آرزو وغیرہ۔

2.4.2 فکری آہنگ

فانی کی شاعری کی دوسری سب سے نمایاں صفت اُن کا فکری آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں زمانہ، زندگی اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کا ایک مخصوص انداز ملتا ہے۔ اس کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ فانی مفکر ہیں یا مفکر شاعر ہیں یا ان کی شاعری مفکرانہ شاعری ہے۔ لیکن چونکہ وہ فلسفہ کے سنجیدہ طالب علم رہے تھے اور بی اے میں باقاعدہ ایک مضمون کے طور پر اُنھوں نے فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا اس لیے اُن کی شاعری میں غور و فکر کا ایک انداز ملتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

بنیاد جہاں کیا ہے مجبور فنا ہونا　　سرمایۂ ہستی ہے محروم بقا ہونا

کیفیت ظہور فنا کے سوا نہیں　　ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

آئینہ بہ صد جلوہ ہر جلوہ بعد رنگ　　کیا کیا نہ کیا تیری تماشا طلبی نے

حاصل خلقت ہے تعمیر جبین سجدہ ریز   شان تکوین دو عالم غایت یک سجدہ ہے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر   نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کلامِ فانی میں پائی جانے والی اس فکری گہرائی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری میں فلسفہ، تصوف اور علم کلام کی اصطلاحیں اپنے خاص اصطلاحی معنی میں استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے:

حق، باطل، حقیقت، مجاز، جلوہ، تجلی، جلال، جمال، جبر، اختیار، ماسوا، عین، وحدت، کثرت، تسلیم، رضا وغیرہ

2.4.3 ڈرامائیت

فانی کی غزلوں کی تیسری صفت ان کے کلام میں پائی جانے والی ڈرامائیت ہے۔ ان کے یہاں مکالموں کی موجودگی اور حرکی اور بصری پیکروں کے ذریعے سے پڑھنے والے کے سامنے چلتی پھرتی ہوئی تصویر پیش کرنے کا انداز ملتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے   یاد جاناں قدم سنبھال اپنا

دو گھڑی کے لیے میزان عدالت ٹھہرے   کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے   کس کو عذر برہنہ پائی ہے

کیا چاہتے ہو منہ سے اللہ بھی نہ نکلے   ارمان دل بقدر یک آہ بھی نہ نکلے

2.4.4 قول محال

فانی کی شاعری کی چوتھی خصوصیت اُن کے یہاں پایا جانے والا قول محال کا انداز ہے۔ قول محال ایسی بات کو کہتے ہیں جو بظاہر سرسری لیکن حقیقتاً گہرے معنی رکھتی ہو۔ فانی کے یہاں اس کی مثالیں دیکھیے:

بخش دے جبر کل کے صدقے میں   ہر گنہ میری بے گناہی کا

عزت رسوائی بھی کہیں تدبیر سے حاصل ہوتی ہے حیف ہے اس کی قسمت پر جو عشق میں رسوا نہ ہو سکا
خطاب روز حشر کی صدائے بازگشت ہوں جواب بے سوال ہوں، سوال بے جواب ہوں
جلوہ ترا طلسم حجابات نور ہے جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے

2.4.5 صوتی حسن

کلام فانی میں کبھی الفاظ کی تکرار سے، کبھی الفاظ کے بعض حصوں کی تکرار سے اور کبھی بعض آوازوں کی تکرار سے صوتی حسن پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ مثلاً:

ہر لمحۂ حیات ہے بیگانۂ حیات فانؔی حیات ہی سے عبارت عدم نہ ہو
صور و منصور و طور ارے توبہ ایک ہے تیری بات کا انداز
دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم بستی بسنا کھیل نہیں یہ بستے بستے بستی ہے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. کلام فانی میں کن علوم کی اصطلاحیں ملتی ہیں؟
9. فانی کے اشعار میں ڈرامائیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟
10. فانی کے اشعار میں استعمال ہونے والی پانچ تراکیب کی نشاندہی کیجیے۔
11. کلام فانی سے تکرار الفاظ یا اصوات کی مثال دیجیے۔

2.5 فانی کی غزل (1)

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
زندگی تو بھی پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　　آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اب اُسے دار پہ لے جا کے سلا اے ساقی　　　یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

2.5.1 غزل کا مجموعی تاثر

آیئے! اس غزل پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ غزل ہم پر کیا تاثر چھوڑتی ہے۔ بالکل بغیر سوچے سمجھے یا سمجھنے کی کوشش کیے بغیر اس غزل کا ایک تاثر تو ہمارے ذہن پر یہ ہوتا ہے کہ اس میں ایسی آوازیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں جو کھینچ کر پڑھی یا گائی جا سکتی ہیں۔ جیسے معما کی الف یا سمجھنے کی 'ے' یا سمجھانے کی 'الف' اور 'ے' دونوں وغیرہ۔ ان آوازوں کی وجہ سے پوری غزل میں موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔ غزل کے مرکزی الفاظ دل، دیوانے، مرنا اور غم خانہ ہیں۔ اور ان سے جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ بڑی حد تک غم انگیز ہے۔

2.5.2 اشعار کی تشریح

آیئے پہلے شعر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلا شعر ہے۔

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　　زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

اس شعر میں شاعر نے زندگی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ وہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ زندگی ایک معمے کی طرح ہے جسے سلجھانا یا حل کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے شاعر نے سمجھنے اور سمجھانے کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی اسے نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے شاعر نے ایک اور مثال پیش کی ہے یعنی یہ زندگی دیوانے کے خواب کی طرح ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ دیوانے کا وجود یوں بھی عقل و خرد کے تصور سے میل نہیں کھاتا اس لیے سمجھنے اور سمجھانے کا عمل اُس سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف خواب بھی حقیقت کا الٹا ہوتا ہے۔ اسے ہم خیال یا وہم یا تصور سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی زندگی جس کے معنی عام طور پر ہونے یا ہست کے لیے جاتے ہیں وہ درحقیقت ہونے کا متضاد ہے اور یہ نہ ہونا اس لیے ہے کہ یہ معمے کی طرح پیچیدہ ہے۔ اسے حل نہیں کیا

جاسکتا۔فانی ہی کا ایک دوسرا شعر اس کی اچھی وضاحت کرتا ہے:

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

غزل کا دوسرا شعر ہے:

مختصر قصہ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں　　راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

شعر شروع ہی قصہ غم سے ہوتا ہے جس کا تعلق شاعر نے دل سے جوڑا ہے۔یعنی یہ سارے غم اسی دل کی بیماری کی وجہ سے حساس ہونے یا صاحب دل ہونے یا عاشق ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔اور یہی کائنات کا راز بھی ہے۔دوسرے مصرعے کے 'اس افسانہ' کے ذریعے پہلے مصرعے کے 'قصہ غم' ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔یعنی پوری دنیا اسی وجہ سے قائم ودائم ہے کہ کائنات کے تمام ذرات اور تمام اجزا ایک دوسرے کی کشش میں یا عام الفاظ میں کہیں تو ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہیں۔یہی عشق یا کشش انہیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہے۔جس دن یہ عشق/ کشس ختم ہو جائے گی، یہ اجزا منتشر ہو کر ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔

تیسرا شعر ہے:

زندگی تو بھی پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے　　ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

اس شعر میں شاعر نے انتہائے یاس سے پیدا نا اُمیدی اور مایوسی کا ذکر کیا ہے۔تخاطب زندگی سے ہے۔ شعر زندگی اور موت کے تضاد کے ذریعے بنایا گیا ہے۔شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میری حیات بھی میری بدقسمتی کے ہاتھوں مجھ سے شرمندہ ہے کہ میں ایسے شخص کے وجود کا باعث کیوں ہوئی اس لیے وہ بھی کسی ایسے بہانے کی تلاش میں ہے کہ کسی طرح اس شخص کو زندگی کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے تو میری شرمندگی دور ہو۔شاعر نے جو بات شعر میں چھپا کر رکھ دی ہے وہ یہ ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود اُسے مجھ سے چھٹکارا کی کوئی شکل نظر نہیں آتی ہے۔

چوتھا شعر ہے:

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

بول چال کے لب ولہجہ اور محبوب کو بلانے کے لطیف انداز نے شعر کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔ بظاہر شاعر اپنی حالت زار کا بیان کر رہا ہے کہ میری حالت ایسی خراب وخستہ ہے کہ اس کا اثر میرے رہنے کی جگہ پر بھی پڑ رہا ہے اور میرا گھر بھی میری حالت سے متاثر ہو کر رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے اگر تم نے کبھی کسی کے گھر کو رنگ بدلتے ہوئے نہیں دیکھا ہے تو میرے گھر کو آ کر دیکھ لو۔ دوسرے مصرعے میں 'تماشا اور غم خانہ' ایک دوسرے کا متضاد پہلو لیے ہوئے ہیں۔ تماشا میں لطف اندوزی کا پہلو چھپا ہوا ہے جبکہ غم خانہ دکھ کا پہلو لیے ہوئے ہے جس سے مفہوم یہ پیدا کیا ہے کہ میرا دکھ / غم بھی ایک لطف کا پہلو لیے ہوئے ہے یا پھر یہ محبوب پر طنز بھی ہو سکتا ہے کہ میرے لیے جو دکھ / غم ہے' تمہارے لیے لطف کا پہلو رکھتا ہے۔ اس لیے اگر تم آ جاؤ تو خوب حظ حاصل کرو گے۔

پانچواں شعر ہے:

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا اے ساقی　　　یوں بہکنا نہیں اچھا ترے دیوانے کا

شعر کا پہلا لفظ 'اب' ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس سے پہلے بہت سی منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں جس دیوانے کا ذکر ہوا ہے وہ دیوانگی کے بہت سے مراحل ومنازل طے کر چکا ہے اور جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے دیوانہ پن کو ختم کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اس لیے اس کے اور دوسروں کے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ اُسے پھانسی دے کر اُس کا کام ہی تمام کر دیا جائے کہ تمہارے دیوانے کا اس طرح ہوش و حواس کھو کر بہکنا اور مارا مارا پھرنا ٹھیک بات نہیں ہے۔ دیوانے کو عام طور پر پابہ زنجیر کرتے ہیں اس لیے اُسے دار پر لے جانے کی بات کہہ کر شاعر نے جنون کی شدت اور اس کی خطرناکی کے پہلو کو اپنی آخری حد تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد کوئی راستہ ہی نہیں بچتا ہے۔

2.6 فانی کی غزل (2)

خوشی سے رنج کا بدلا' یہاں نہیں ملتا　　　وہ مل گئے' تو مجھے آسماں نہیں ملتا

مجاز اور' حقیقت کچھ اور ہے' یعنی　　　تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل! تو ہی اب لگادے آگ   کہ بجلیوں کو میرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں   مجھے یہ غم، کہ غم جاوداں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے؟ ترے تیر بے پناہ کی خیر   بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

2.6.1 غزل کا مجموعی تاثر

پہلی غزل کی طرح ہی فانی کی دوسری غزل بھی خاصی lyrical ہے۔اس میں یہاں، گماں، آسماں، بیاں، آشیاں، جاوداں اور ناتواں کے قافیوں اور 'نہیں ملتا' کی ردیف نے موسیقیت میں مزید اضافہ کردیا ہے۔اب آیئے! اس غزل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

2.6.2 اشعار کی تشریح

غزل کا پہلا شعر ہے:

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا   وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

پہلا مصرعہ ایک بیان ہے کہ خوشیاں غموں کا بدل نہیں ہوتی ہیں۔'یہاں' استعمال کرکے اس بات کا بھی تعین کردیا ہے کہ اسی دنیا کی بات ہورہی ہے۔کسی اور دُنیا کی بات نہیں ہورہی ہے۔پہلے مصرعے میں استعمال ہونے والے الفاظ 'خوشی' اور 'غم' کی رعایت سے دوسرے مصرعے میں 'وہ' اور 'آسماں' استعمال ہوا ہے۔'وہ' یعنی محبوب کا تعلق خوشی سے ہے۔وہ مل گئے تو اس دنیا کی خوشیاں تو مل گئیں۔رنج/دکھ سے ارتقاع پیدا ہوتا ہے۔اس کی رعایت سے شاعر نے 'آسماں' کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی غموں کی دُنیا انسان کے اندر ایک طرح کا ارتقاع پیدا کرتی ہے۔محبوب کا وصل اس کے عشق کو ختم کردیتا ہے۔اس کے ہجر میں عاشق کی شخصیت میں جو بلندی پیدا ہوتی ہے وہ وصل کے ساتھ ہی جاتی رہتی ہے۔یا تو محبوب مل سکتا ہے یا شخصیت کی بلندی نصیب ہوسکتی ہے۔دونوں ایک ساتھ ممکن نہیں۔آسمان شخصیت کی بلندی کا استعارہ ہے۔خوشی اور رنج میں صنعت تضاد ہے اور ان دونوں کی رعایت سے دوسرے مصرعے

میں رکھے گئے الفاظ 'وہ' اور 'آسماں' میں لف ونشر مرتب کی صنعت کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

دوسرا شعر ہے:

مجاز اور' حقیقت کچھ اور ہے' یعنی تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

اس شعر میں شاعر نے محبوب کے قول اور فعل کے تضاد کو بیان کیا ہے۔یعنی وہ جو کہتا ہے وہ کرتا نہیں ہے۔ اسی بات کو شاعر نے مجاز اور حقیقت کے پردے میں بیان کیا ہے۔دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔مجاز وہ ہے جو حقیقت نہیں ہے' حقیقت کا الٹا ہے۔حقیقت محبوب کی نگاہ ہے جو سچائی کا اظہار کر رہی ہے۔اور مجاز جو لا حقیقت ہے یعنی حقیقت نہیں ہے وہ اس کا بیان ہے۔محبوب کی نگاہ جو کچھ کہتی ہے اس کے قول سے اس کی کوئی مطابقت نہیں ہے۔وہ زبانی طور پر تو ہماری محبت کا اقرار کرتا ہے لیکن اس کی نگاہیں درحقیقت کچھ اور کہتی ہیں۔

تیسرا شعر ہے:

بھڑک کے شعلۂ گل! تو ہی اب لگادے آگ کہ بجلیوں کو میرا آشیاں نہیں ملتا

اس شعر میں شاعر نے گھر کو تباہ و برباد کرنے یا گھر کو آگ لگانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔عام طور پر بجلیاں آشیانے کو جلانے کا سبب بنتی ہیں لیکن شاعر کو شکایت یہ ہے کہ بجلیوں کو جلانے کے لیے میرا گھر ملتا ہی نہیں ہے۔اس لیے وہ باغ میں موجود گلاب کے پھولوں سے درخواست کرتا ہے کہ تم میں بھی تو آگ کے شعلوں کا رنگ موجود ہے۔تم ہی کیوں نہیں بھڑک کر میرے آشیانے کو تباہ و برباد کر دیتے ہو۔معنی کی ایک سطح یہ بھی ہو سکتی ہے کہ 'گل' سے محبوب اور 'شعلہ گل' سے محبوب کی خوبصورتی کو استعارہ کیا گیا ہو۔اور محبوب کو چونکہ 'خانہ برانداز' کہا ہی جاتا ہے کہ وہ گھر کو تباہ و برباد کرنے والا ہوتا ہے اس لیے شاعر یہ درخواست کرتا ہے کہ اگر بجلیاں جلا کر میرے آشیانے کو خاک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو تم ہی اسے تباہ و برباد کر دو۔چھپا ہوا پہلو یہ کہ عاشق کے لیے یہی بربادی سب سے بڑی آبادی ہے۔

چوتھا شعر ہے:

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں　　مجھے یہ غم، کہ غم جاوداں نہیں ملتا

یہ شعر ذرا احتیاط سے پڑھے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ پہلے مصرعے میں محبوب کی بدگمانی کا ذکر ہے کہ وہ بدگمان ہے۔لیکن اس بدگمانی کے دو پہلو ہیں۔ایک پہلو یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس درجہ بدگمان ہے کہ اُس کی اس بدگمانی کی وجہ سے میرے اندر زندگی کے غموں کو برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ محبوب مجھ سے اس وجہ سے بدگمان ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں زندگی کے غموں کو برداشت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔پہلی صورت میں دوسرا مصرعہ بے معنی ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دوسری صورت میں پہلے مصرعے کا 'وہ' اور دوسرے مصرعے کا 'مجھے' ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے ہیں۔ عاشق اپنی صورتحال کا بیان کررہا ہے کہ عجب طرح کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ایک طرف محبوب یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں زندگی کے غموں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔اس لیے وہ مجھ سے منھ موڑ رہا ہے اور دوسری طرف اپنا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی ایسا غم ہی نہیں مل رہا ہے جو غمِ جاوداں بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکے اور چھوٹے موٹے غموں کے ساتھ مجھے جینا پسند نہیں۔

پانچواں شعر ہے:

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر　　بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

یہ شعر حاصل غزل ہے۔شاعر کہنا صرف یہ چاہتا ہے کہ میرا دل کھو گیا ہے' آپ کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے' مجھ سے باغی ہو کر یا روٹھ کر کسی اور کے پاس چلا گیا ہے۔اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اسے بہت دن ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اس کا دل کہاں چلا گیا ہے؟ کس کے پاس چلا گیا ہے؟ لیکن وہ تجاہل عارفانہ اختیار کرتا ہے اور جان بوجھ کر' انجان بن کر خود محبوب سے ہی یہ سوال پوچھتا ہے کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میرا دل کہاں چلا گیا ہے۔ معلوم ہو تو ذرا بتانا۔لیکن آہستہ سے اُس کی تیر نظر کا ذکر بھی کر دیتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس سے حفاظت ممکن نہیں۔ پھر یہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے محفوظ رکھے۔یعنی تمہاری اسی تیر نگاہ کی وجہ سے تو میرا دل کھو گیا ہے۔کیا تمہیں ہی یہ بات پتہ نہیں ہے۔کم سے کم تمہیں تو یہ بات معلوم ہونی ہی چاہئے تھی۔

2.7 خلاصہ

شوکت علی فانی بدایونی 13 ستمبر 1879ء کو بدایوں کے قصبہ اسلام نگر میں پیدا ہوئے۔ خاصے دشوار گزار حالات سے گزرتے ہوئے 27 اگست 1941ء کو فانی کا انتقال ہوگیا۔ فانی کی شاعری پر غور کریں تو سب سے پہلے جو چیز ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کی مخصوص تراکیب ہیں۔ فانی کی شاعری کی دوسری سب سے نمایاں صفت اُن کا فکری آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں زمانہ، زندگی اور کائنات کے بارے میں غور وفکر کا ایک مخصوص انداز ملتا ہے۔ فانی کی غزلوں کی تیسری صفت ان کے کلام میں پائی جانے والی ڈرامائیت ہے۔ ان کے یہاں مکالموں کی موجودگی اور حرکی اور بصری پیکروں کے ذریعے سے پڑھنے والے کے سامنے چلتی پھرتی ہوئی تصویر پیش کرنے کا انداز ملتا ہے۔ فانی کی شاعری کی چوتھی خصوصیت اُن کے یہاں پایا جانے والا قول محال کا انداز ہے۔ کلام فانی میں کبھی الفاظ کی تکرار سے، کبھی الفاظ کے بعض حصوں کی تکرار سے اور کبھی بعض آوازوں کی تکرار سے صوتی حسن پیدا کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

فاؔنی کی مذکورہ بالا دونوں غزلیں ان کی شاعری کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں۔ سامنے کے عشقیہ موضوعات کو بھی وہ اس فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو پہلی نظر میں کسی اور موضوع کا گمان ہونے لگتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ہر شعر اپنی اپنی جگہ ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. فاؔنی بدایونی کے مختصر سوانحی حالات لکھیے۔
2. فاؔنی نے زندگی کو دیوانے کے خواب سے کیوں تعبیر کیا ہے؟
3. مندرجہ ذیل اشعار کی اپنے الفاظ میں تشریح کیجیے:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی تو بھی پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. کلامِ فانؔی میں فلسفیانہ آہنگ کی نشاندہی کیجیے۔
2. فانؔی کی حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی شاعرانہ خصوصیات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2.9 فرہنگ

ارتفاع	بلندی
معتوب	جس پر عتاب کیا گیا ہو
الم	غم، مصیبت
آلام	الم کی جمع
خسارہ	گھاٹا، نقصان
جتن	کوشش، جدوجہد
تجاہلِ عارفانہ	جان بوجھ کر انجان بننا

2.10 معاون کتابیں

1.	فانؔی کی شاعری	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
2.	فانؔی	پروفیسر عبدالشکور
3.	فانؔی بدایونی	پروفیسر مغنی تبسم

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. فانؔی کا پورا نام شوکت علی خاں تھا۔

2. فانؔی 1879ء میں پیدا ہوئے۔

3. فانؔی کا انتقال 27 اگست 1941ء کو ہوا۔

4. فانؔی نے آگرہ سے ''تسنیم'' نام کا رسالہ جاری کیا۔

5. فانؔی کے دو معاصرین اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی ہیں۔

6. فانؔی کے دو شعری مجموعے 'عرفانیات فانی' اور 'وجدانیات فانی' ہیں۔

7. فانؔی کا پیشہ وکالت تھا۔

8. فانؔی کے کلام میں فلسفہ، علم کلام اور تصوف کی اصطلاحیں ملتی ہیں۔

9. فانؔی کے کلام میں ڈرامائیت مکالموں کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے۔

10. فانؔی کے کلام میں استعمال ہونے والی پانچ تراکیب مندرجہ ذیل ہیں:

ثبات زندگی بے ثبات، تاب رنج زیست، اضطراب ناپیدا، حسن جفاپسند، محشر سکوت

11. کلام فانی میں تکرار الفاظ واصوات کی بہترین مثال اُن کا یہ شعر ہے:

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم　　　بستی بسنا کھیل نہیں یہ بستے بستے بستی ہے

اکائی 3 : آرزؔو لکھنوی

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 آرزؔو:حیات

3.4 آرزؔو کی شاعرانہ خصوصیات

3.4.1 پہلا دور

3.4.2 دوسرا دور

3.4.3 تیسرا دور

3.4.4 آرزؔو کی خالص اردو

3.5 آرزؔو کی غزل (1)

3.5.1 مجموعی تاثر

3.5.2 اشعار کی تشریح

3.6 آرزو کی غزل (2)

3.6.1 مجموعی تاثر

3.6.2 اشعار کی تشریح

3.7 خلاصہ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 فرہنگ

3.10 معاون کتابیں

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

3.1 اغراض ومقاصد

اردو شاعری کی تاریخ میں دبستان لکھنؤ کوایک امتیازی مقام حاصل ہے۔شاعری کی تمام اصناف سخن میں ریختی اور معاملہ بندی کو چھوڑ کر اس دبستان نے اردو زبان کی جوگراں قدر خدمات انجام دی ہیں' اس کا اعتراف تمام اہل اردو کرتے ہیں۔آرزو لکھنوی کا تعلق اسی لکھنوی دبستان سے ہے۔اس اکائی کا مقصد آپ کو آرزو لکھنوی کے حالاتِ زندگی' شخصیت' شاعرانہ عظمت' شاعری میں ان کی انفرادیت سے متعارف کروانا ہے۔ساتھ ہی ساتھ فنِ عروض' قواعد اور اصلاح زبان سے متعلق بھی آرزو کی خدمات سے واقف کرانا ہے۔

3.2 تمہید

اردو شاعری کی ابتدا سے دورِ حاضر تک غزل ہمیشہ ہی شاعروں کی پسندیدہ صنف سخن رہی ہے۔ترقی پسند تحریک کے دور میں کئی ادیبوں نے غزل کی گردن زدنی کا اعلان کیا لیکن اس دور میں بھی اصغر گونڈوی' فانی بدایونی' حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی نے یہ ثابت کردیا کہ غزل ہمیشہ وقت کے ساتھ رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ غزل ہمیشہ سے اردو کی تمام اصناف شاعری میں سب سے زیادہ مقبول صنف رہی ہے۔شاید غزل کے اسی کس بل کو دیکھتے ہوئے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا گیا۔اردو شاعری کی اسی مقبول ترین صنف کو حضرت آرزو نے اپنی طبع آزمائی کے لیے منتخب کیا۔ویسے تو انہوں نے طبعِ رسا کا جوہر دکھانے کے لیے قصیدہ' مثنوی' رباعی' قطعہ' مرثیہ اور سلام بھی بہ کثرت کہے ہیں۔جن کے دیکھنے سے ان کی پرگوئی اور زبان پر بے پناہ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جو چیز ان کی ناموری کا سبب بنی وہ غزل ہی ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد امید ہے کہ آپ آرزو کی حیات' شاعری اور ان کی خدمات سے واقف ہوجائیں گے۔

3.3 آرزو لکھنوی: حیات

آرزو کا نام سید انور حسین عرفیت منجھو صاحب ہے۔ان کی ولادت 1872ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ان کے

والد میر ذاکر حسین، یاسؔ لکھنوی بھی شاعر تھے۔ انہوں نے بیٹے کی ولادت پر مادہ تاریخ یوں رقم کیا تھا:

بار دیگر شکر کردم از زبان

پانچ سال کی عمر سے سلسلہ تعلیم شروع ہوا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں حکیم میر قاسم علی صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد جو کچھ تعلیم حاصل کی وہ مولانا سید آقا حسن صاحب سے حاصل کی۔ علم عروض حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی سے سیکھا اور ان ہی سے اصلاحِ سخن بھی لیا۔ چوں کہ گھر میں شعر وشاعری کا ماحول تھا یعنی والدِ بزرگوار اور بڑے بھائی میر یوسف حسن، قیاسؔ لکھنوی شاعر تھے۔ لہٰذا سید انور حسین، آرزوؔ لکھنوی نے بھی بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ استاد کی توجہ اور محنت سے لکھنؤ کے باکمال شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہیں شاعری پر اتنی مہارت حاصل ہوگئی کہ استاد نے اپنے دوسرے شاگردوں کو انہیں کے پاس بھیج دیا۔ جلال لکھنوی کی وفات کے بعد آرزو کو ان کی گدی ملی۔

آرزو نے تقریباً 15 برس کی عمر میں اپنی پہلی غزل نواب منجھلے آغا صاحب معیّن کے مشاعرے میں پڑھی۔ یہ مشاعرہ طرحی مشاعرہ تھا اور طرح تھی ''انجمن میں نہیں، چمن میں نہیں''، آرزوؔ لکھنوی کی غزل کا مطلع تھا:

ہمارا ذکر جو ظالم کی انجمن میں نہیں
جبھی تو درد کا پہلو کسی سخن میں نہیں

ایک اور شعر یوں تھا کہ:

شہید ناز کی محشر میں دے گواہی کون
کوئی لہو کا بھی دھبہ مرے کفن میں نہیں

ان دونوں اشعار سے اس شاعر کی طبع رسا کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے جو پندرہ برس کے سن میں اس بلند پایہ تخیل کے شعر کہہ رہا ہو۔ کم سنی میں اس طرح کا زبان و بیان، لطافت اور نکھرا ہوا شعری ذوق دیکھ کر اہل زبان واہ واہ کہہ اٹھے۔ پھر کیا تھا آرزو کا چرچا ہونے لگا اور ان مشق نے آگے آنے والے دونوں میں یہ ثابت کر دیا کہ یہ بچہ ایک

ہونہار طالب علم ہے۔

آرزو کے زمانے کا لکھنؤ آج کا لکھنؤ نہیں تھا۔ اس زمانے کے لوگ جب کسی ہونہار بچے کو جان لیتے تھے تو اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے تاکہ بچہ اپنی مشق جاری رکھے اور آگے چل کر نام پیدا کرے۔ ایسے ہی ایک بزرگ میرن صاحب تھے۔ جنہوں نے آرزو کو ایک دن یہ مصرع دیا:

''اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں''

مصرع دے کر بزرگوار نے کہا کہ صاحب زادے تم اس پر ایک سال میں مصرع لگا دو تو میں تمہیں شاعر مان لوں۔ انہوں نے کہا میں ابھی کوشش کر کے دیکھتا ہوں کیوں کہ ایک سال زندہ رہنے کا کیا اعتبار ہے۔ یہاں تو ایک سانس کے بعد دوسری کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تھوڑی دیر کے غور و فکر کے بعد اس پر یہ مصرع لگا دیا کہ:

دامن اس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں
اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

ان اشعار کو دیکھ کر آرزو کی موزونی طبع کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ شروع شروع میں اپنے استاد کی شاعری کا رنگ اختیار کیا۔ یہ ان کی شاعری کا دورِ اول ہے جس میں جذبات کا دریا بے اختیار ہو کر بہتا چلا جاتا ہے۔ آرزو کا شماران شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے لکھنؤ کی زبان کو سنوارنے کا کام کیا۔ انہوں نے زبان و قواعد اور عروض پر کافی کام کیا اور اس سلسلے میں ان کا رسالہ ''نظامِ اردو'' ایک اہم تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

آرزو لکھنوی اردو کے ان چند باکمال شعرا میں سے ہیں جن کا قلم نثر کے میدان میں بھی بڑی روانی سے چلتا ہے۔ چنانچہ کئی قابل قدر ڈرامے مثلاً ''متوالی جوگن''۔ ''دل جلی بیراگن'' اور ''شرارۂ حسن'' وغیرہ ان کی نثری تصنیفات ہیں۔ انہوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی پہچان ان کی غزلوں سے ہی ہے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے ''فغانِ اردو''۔ ''جہانِ اردو''۔ ''بیانِ آرزو'' اور ''سریلی بانسری'' شائع ہوئے ہیں۔ زبان و بیان پر ایسی قدرت تھی کہ ان کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں فارسی و عربی کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہے۔

گاندھی جی اسی زمانے میں ہندوستانی زبان کے فروغ کی کوششیں کررہے تھے۔ لہٰذا آرزو نے ہندوستانی میں بھی اپنی دھاک جمالی۔ ممبئ اور کولکاتا کے تھیٹروں کے لیے ڈرامے اور فلموں کے لیے نغمہ نگاری بھی کی، جہاں ہندوستانی کو خاص طور سے پسند کیا جاتا ہے۔ ان کی اس رنگ کی شاعری کو ''سریلی بانسری'' میں دیکھا جاسکتا ہے کہ آسان زبان میں لکھنے کے باجود وہ اپنے خیالات وجذبات کا اظہار بڑے سلیقے سے کرلیتے تھے۔ لکھنوی زبان کے ماہر اس شاعر کا انتقال 1951ء میں کراچی میں ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. آرزو لکھنوی کا پورا نام کیا ہے؟

2. آرزو کے اس مجموعۂ کلام کا نام بتایئے جس میں خاص طور سے انہوں نے ہندوستانی میں شاعری کی ہے۔

3. آرزو کے دو ڈراموں کے نام لکھیے۔

3.4 آرزو لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

آرزو کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

3.4.1 پہلا دور

پہلا دور جو کہ ابتدائی زمانہ ہے اس میں حضرت جلال لکھنوی کا اثر خاص طور سے نمایاں ہے اور اسی دور میں بڑی محنت اور زبردست طریقے سے ریاض کیا۔ لہٰذا اس دور کا رنگ ذیل کے اشعار سے دیکھا جاسکتا ہے:

اس دل سے خدا سمجھے جس نے ہمیں مارا ہے
جو دشمنِ جانی ہے وہ جان سے پیارا ہے

راحت ہو کہ بے چینی دونوں میں ہے اک لذت
جو تم کو گوارا ہے وہ ہم کو گوارا ہے

خودکشی کا آپ پر الزام دھرتے جائیں گے
ہم تو مرتے ہیں مگر بدنام کرتے جائیں گے

مجھ کو میری روش مٹاتی ہے   پاؤں کی خاک سر پہ آتی ہے
چارہ گر سے چھپا رہا ہوں درد   بات کی کد میں جان جاتی ہے

....

اپنے کیے کا رونا کیا ہے ؟   رونے سے آخر ہونا کیا ہے ؟
سنگِ در اس کا خاک گلی کی   تکیہ کیا ہے بچھونا کیا ہے ؟
پھل نہیں اچھا عشق کا اے دل   ایسے شجر کا بونا کیا ہے ؟

ان اشعار سے ان کے ابتدائی رنگ شاعری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آرزو کی لگن، مشق اور فن عروض پر ان کی گرفت کو دیکھتے ہوئے استاد جلال لکھنوی نے اپنے کچھ شاگردوں کو ان کے سپرد کردیا کہ ان سے کلام کی اصلاح لیا کریں۔ یہیں سے آرزو کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ان کی شاعری میں پہلے کے مقابلے تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے اور شاعری پر میؔر اور مومؔن کا رنگ غالب آنے لگتا ہے۔

3.4.2 دوسرا دور

آرزؔو کی شاعری کا یہ وہ دور ہے جس میں ان کی شاعری میں سوز و گداز، رنج، دردانگیزی کی فضا شروع ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں متانت وسنجیدگی کے باوجود شوخی ادا اور چھیڑ کی ادا بھی پائی جاتی ہے۔ شگفتہ بحر، لفظوں کا موزوں انتخاب اور دلکش ترکیبوں کے ساتھ سوز و گداز کا عنصر کافی موثر ہوجاتا ہے۔ اس دور کی کیفیت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے کیجیے:

پھر مرے زہد کے ساماں پہ تباہی آئی
قصد توبہ کا کیا تھا کہ جمائی آئی

یوں آگ لگاتے پھرتے ہو کیوں جب گرم ہوا سے ڈرتے ہو
دل پہلے جلا کر خاک کیا اب ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو

جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

کیا جانے ٹپکے آنکھ سے کس وقت خونِ دل
آنسو گرا رہا ہوں جگہ چھوڑ چھوڑ کے

ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا
مانند چراغ اک سوختہ تن گہہ ہنستا تھا گہہ روتا تھا

پردہ اٹھ کر گر گیا ہم پھر بھی ہیں محروم دید
آنکھ میں آنسو تھے کیوں کر آنکھ بھر کر دیکھتے
آرزؔو ہشیار تھے جو ہوش کھو بیٹھے کلیم
خیر آنکھوں کی نہ تھی گر آنکھ بھر کر دیکھتے

3.4.3 تیسرا دور

آرزو کی شاعری کا تیسرا دور وہ ہے جب کہ ان کی شاعری میں ادا بندی، تصوف اور فلسفیانہ مضامین شامل ہوئے۔ یہ وہ دور ہے جب انہیں ہر صنف کی طبع آزمائی پر پوری قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ ان کی قادر الکلامی کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ غزل کے علاوہ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی وغیرہ میں انہوں نے اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑا ہے، جن کے دیکھنے سے ان کی پر گوئی اور زبان پر مکمل قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود زبان اور محاورہ میں

انہوں نے میرؔ کی روش اختیار کی حالانکہ اس دور میں فلسفہ نے ان کی شاعری پر غالبؔ کا رنگ بھی پیدا کر دیا۔ مشکل سے مشکل صوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین کو ایسی صفائی اور روانی سے ادا کر جاتے ہیں کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کیسا مضمون اتنی خوبی کے ساتھ شاعر ادا کر گیا ہے۔ غالبؔ کی اکثر زمینوں میں آرزو نے غزلیں کہی ہیں لیکن زبان و بیان اور طرز ادا میر کا ہی اختیار کیے رکھا۔ اس دور کی شاعری کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

دوست نے دل کو توڑ کر نقشِ وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

بیٹھا ہوں اپنے قتل کا ساماں کیے ہوئے
یعنی خیالِ نازکِ مژگاں کیے ہوئے
یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں
آلودہ میرے خون میں داماں کیے ہوئے

نہ تھا جس میں کوئی اس آنکھ میں اب اک تمھیں تم ہو
یہ گھر سنسان ہوکر بچ گیا سنسان ہونے سے

بے کل ہے ادھر جی ' تو ادھر آنکھ چنچل
دونوں میں پہل دیکھیے ہوتی ہے کدھر سے

گھر یہ تیرا سدا نہ میرا ہے
رات دو رات کا بسیرا ہے

کھینچ کر لوگ ترے در سے لیے جاتے ہیں
کیا محبت کے صلے یوں ہی دیے جاتے ہیں
یہی جینا ہے تو مرنے کو برا کیوں کہیے
کوئی امید نہیں پھر بھی جیے جاتے ہیں

3.4.4 آرزو کی خالص اردو

شاعرانہ خصوصیات کا ذکر تب تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ آرزو کی خالص اردو کا ذکر نہ کیا جائے۔ ایسی غزلیں بہت سی ہیں اور خاص طور سے ان کا مجموعہ کلام ''سریلی بانسری'' جس میں انہوں نے عربی فارسی الفاظ کا استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی آسان زبان میں وہ اپنے تاثرات ومحسوسات نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کی خوبی زبان ایسی ہے کہ زمین کیسی ہی مشکل کیوں نہ، ردیف کیسی ہی کیوں نہ ہومگر ان کی آب دار طبیعت اپنی زبان دانی کے جوہر دکھا کے رہتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہل ممتنع پر جو قدرت آرزو کو حاصل تھی اردو شاعری میں بہت کم لوگوں کو ایسی قدرت حاصل تھی۔ فارسی عربی الفاظ سے مبرا اشعار کی مثالیں دیکھیے :

اندھیرے گھر میں کبھی چاندنی نہیں آتی
ہنسی کی بات پہ بھی اب ہنسی نہیں آتی

کر ہی کیا سکتا تھا آنکھوں کا ذرا سا پانی
جب لگی بجھ نہ سکی کھول کے ابلا پانی
کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی امنگ
جی بہالے گیا برسات کا پہلا پانی

نہیں کچھ اس کا پچھتاوا کہ جی کی رہ گئی جی میں
یہ جانے کون گھبراہٹ میں کیا منھ سے نکل جاتا

جہاں لے کے پہنچی ہے جی کی اداسی
وہ کیسی جگہ ہے نہ گھر ہے نہ بن ہے

ملی آنکھ ماتھے سے ٹپکا پسینا
یہ چاہت کے ساون کی پہلی جھڑی ہے

ہے ایک ہی ہونا تو یہ ان بن نہیں اچھی
میرا نہ بن تو مجھے اپنا سا بنادے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. آرزو کے دوسرے دور کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
5. ''سریلی بانسری'' مجموعے کی کیا خوبی ہے؟
6. تیسرے دور کی شاعری پر کن شعراء کا اثر دکھائی دیتا ہے؟

3.5 آرزو کی غزل (1)

1. اول شب وہ بزم کی رونق، شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے، ختم تھا یہ افسانہ بھی

2. خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو، شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھا رہاہوں، جو نہ کرے بیگانہ بھی

3. ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

4. وحدت میں کی کثرت پیدا، جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے، کعبہ بھی بت خانہ بھی

5. دورِ مسرت آرزوؔ اپنا، کیسا زلزلہ آگیں تھا؟
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

3.5.1 مجموعی تاثر

یہ غزل آرزوؔ کے مجموعہ کلام ''جہانِ آرزو'' سے منتخب کی گئی ہے۔اس غزل کے مطالعہ سے طلبا کو آرزو کی زبان اور ان کے تخیل و تجربات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ ان کا ذوق کتنا ستھرا ہوا تھا۔ یہ غزل تصوف اور تجربات و مشاہدات دونوں طرح کے اشعار سے مزین ہے۔شاعر جہاں عاشق و معشوق کی باتیں کرتا ہے وہاں معاملات کیسے ہی نازک مرحلے کے کیوں نہ ہوں، اپنی انانیت کے جذبے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔انہیں تصوف اور فلسفے سے خاصا لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی بھی کچھ کچھ جھلک اس غزل میں بھی نظر آتی ہے۔ایک بات اور خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ پوری غزل سہل ممتنع میں ہے۔

3.5.2 اشعار کی تشریح

پہلے شعر میں ایک بھی ایسا لفظ نہیں جس کے معنی آپ کو نہ معلوم ہوں۔اس قدر آسان شعر کو سہل ممتنع کی مثال کہا جاسکتا ہے۔ بظاہر شعر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں شاعر نے جس مضمون کو باندھنے کی کوشش کی ہے وہ فلسفیانہ ہے۔آرزو کہتے ہیں کہ رات کے پہلے پہر، شمع اور پروانہ یعنی عاشق و معشوق جب ایک ہی محفل میں ہوں تو پھر اس محفل کی رونق، چہل پہل اور خوشی کے سماں کا کیا بیان ہوسکتا ہے لیکن اگلے مصرعے میں افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ایسی خوشی کی محفل؛ ایسی رونق والی بزم رات کے ختم ہوتے ہوتے ختم ہوجائے گی۔اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاعر اس شعر میں دنیا اور زندگی کا فلسفہ بیان کر رہا ہو کہ اس چند روزہ زندگی کے دن آپ چاہے جتنے عالی شان

ڈھنگ سے کیوں نہ گزاریں مگر اس کی کہانی بھی رات ہی کی طرح ختم ہونے والی ہے۔اب اس شعر کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ اس چندروزہ زندگی کا اعتبار کیا کرنا اور اس کے لیے اتنا اہتمام کیوں جبکہ یہ ختم ہونے والی ہے۔میرؔ نے کہا ہے کہ:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

غالبؔ نے بھی اس سے ملتے جلتے مضمون کو اپنی طرز میں یوں باندھا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

دوسرے شعر میں شاعر سماج کی تلخ حقیقت بیان کر رہا ہے' جو کہ ہمارے اپنے سماج کی سچائی ہے۔یعنی شرکت' ساجھا اور مشترکہ کوئی بھی چیز ہو' حتیٰ کہ خون ہی کی شرکت کیوں نہ ہو مگر وہ ایک نہ ایک دن جھگڑے کا سبب بنے گی۔دوسرے مصرعے میں شاعر نے جو کہنے کی کوشش کی ہے اس کے بارے میں کہاوت ہے کہ نہ بھائی ایسا دوست نہ اور نہ بھائی ایسا دشمن اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کو جو نقصان جو دکھ' جو مصیبتیں اپنوں سے ملتی ہیں وہ غیر سے کبھی بھی نہیں مل سکتیں۔اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔یعنی جب کلام میں دو متضاد لفظ یکجا ہو جائیں تو اسے تضاد کہتے ہیں: جیسے رات اور دن' صبح اور شام' اپنا اور بیگانہ وغیرہ۔

تیسرا شعر: ایک لگی یعنی لگاؤ' انسیت' محبت کے دو اثر ہیں اور دونوں ہی اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہیں۔لو کا مطلب ہے آرزو یعنی شمع جس آرزو' جس امید میں کھڑی ہے اس لحاظ سے پروانہ بھی رقص کر رہا ہے۔شمع کا لو لگائے کھڑا رہنا' اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شمع جب روشن ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلاتی ہے۔اس کے اس عمل پر پروانہ بھی شمع کے ارد گرد رقص کرتے ہوئے اپنی جاں نثار کر دیتا ہے۔مجموعی طور پر اس شعر کا مطلب یہ نکلا کہ اگر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے تو آپ بھی اس لحاظ سے اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کیجیے۔یہی انسانیت کا تقاضا ہے اور یہی آدمیت بھی ہے۔

چوتھے شعر کو پڑھتے ہی غالبؔ کا یہ شعر بے ساختہ ذہن میں آتا ہے کہ:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہوگئیں

یہ تصوف کا شعر ہے۔ اللہ ایک ہے لیکن اس کے روپ الگ الگ ہیں۔ کوئی اللہ' کوئی رام' کوئی ایشور تو کوئی گاڈ کے نام سے اسے یاد کرتا ہے' اس کی عبادت کرتا ہے۔ یہاں شاعر کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے ماننے کے طریقے الگ الگ ہیں ورنہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ جب کعبہ اور بت خانہ دونوں ایک ہی تھے۔ اس شعر میں آرزو ہندو مسلم ایکتا اور قومی یکجہتی کے جذبوں سے سرشار نظر آتے ہیں ساتھ ہی کثرت میں وحدت کے قائل بھی۔ دنیا میں آئے دن اور ہندوستان میں بالخصوص جو مذہبی لڑائیاں ہوا کرتی ہیں اس کے پیش نظر یہ شعر بہت ہی خوب تر ہے کہ حضرتِ انسان نے خود طرح طرح کی چیزیں پیدا کی ہیں ورنہ کعبہ وبت خانہ جب ایک جگہ تھا تب بھی سب اس کی عبادت کرتے تھے۔

پانچویں شعر میں شاعر خود اپنی ذات سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ اے آرزوؔ! اپنا خوشیوں کا زمانہ بھی کیسا زلزلہ آگیں تھا کہ جس میں ہم ایک پیانہ بھی لب تک نہ لا سکے۔ یعنی شاعر کی زندگی میں خوشیوں کے لمحے بہت کم ہی آئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ تشنہ ہی رہا۔ اپنے انہیں لمحات کو یاد کرتے ہوئے آرزو سوال کر رہے ہیں کہ اتنی دیر کے لیے بھی خوشی حاصل نہ ہوسکی کہ جس میں ایک پیانہ پی لیتے یا ایک محفل سجا لیتے۔

3.6 آرزو کی غزل (2)

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سینکڑوں ڈوب مرے پھر بھی ہے اتنا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

پھیلتی دھوپ کا روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی

رس ہی رس جن میں ہے اور سیل ذرا سا بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی
رولیا پھوٹ کے چھاتی میں جلن اب کیوں ہو
آگ پگھلا کے نکالا ہے یہ جلتا پانی

3.6.1 مجموعی تاثیر

یہ غزل آرزو لکھنوی کے مجموعے ''سریلی بانسری'' سے منتخب کی گئی ہے۔ اس بات کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ ''سریلی بانسری'' میں آرزو کے اس کلام کو شامل کیا گیا ہے جس میں خالص ہندوستانی زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور جس میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے۔ اس غزل کے مطالعے سے آپ کو اس بات کا اندازہ تو ہوگا ہی ساتھ ہی پانی لفظ کے استعمال سے آرزو نے جو جوہر دکھائے ہیں اس سے بھی آپ لطف اندوز ہوں گے۔ پانی سے جڑے ہوئے جتنے محاورے ہیں ان سے بھی شاعر نے جو کمال دکھائے ہیں اور رنگا رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی خاص توجہ کی مستحق ہے۔

3.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو آنکھوں میں ذرا سا ہی پانی ہوتا ہے لیکن اس ذرا سے پانی کا کیا کرشمہ ہے کہ اس میں نہ جانے کتنے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں پھر بھی ان میں اتنا پانی ہے۔ اس شعر میں کلیدی لفظ پانی ہے جس کا استعمال شاعر نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ آنکھوں کا پانی ڈھلنا اور آنکھوں کا پانی مرجانا وغیرہ جیسے محاوروں کو مدنظر رکھتے ہوئے جب اس شعر میں غور کریں تو لفظ پانی کا مسئلہ آسان ہوتا نظر آئے گا۔ پانی یعنی شرم' لحاظ' حیا' ادا وغیرہ۔ سینکڑوں کے مرنے سے یہ مراد قطعی نہیں کہ حقیقتاً ان کا قتل ہو رہا ہے بلکہ وہ محبوب کی اداؤں' ناز اور دلفریبی پر اپنی جان قربان کرتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم سبھی کو معلوم ہے کہ آنکھوں میں بہت تھوڑا سا پانی ہوتا ہے لیکن جب اس پانی سے مراد حیا اور ادا

ہوتو پھراس ''ذرا'' کا ک معاملہ بالکل الگ ہی ہوجاتا ہے۔چوں کہ آنکھوں کا یہ پانی اصل پانی یا کسی جھیل کا پانی نہیں ہے۔لہٰذا محبوب کی اداؤں پر نہ جانے کتنے قربان ہوں گے کیوں کہ اس میں ابھی بھی اتنا پانی باقی ہے۔

دوسرا شعر: اردو شاعری میں محبوب کی زلفوں کو اکثر گھٹا' بادل سے تشبیہ دی گئی ہے۔زیر بحث شعر کے دوسرے مصرعے میں استعارہ ہے۔آرزو نے بھی اس شعر میں یہی کہنے کی کوشش کی ہے لیکن ''کس'' سے مراد کوئی اور نہیں بلکہ معشوق ہی ہے۔معشوق اپنی بھیگی ہوئی زلفوں سے جو پانی اپنے عاشق پر چھڑک رہا ہے وہ اس طرح مسلسل اور لگاتار چھڑکے جارہا ہے کہ عاشق کو گمان ہونے لگتا ہے کہ ''جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی ''یعنی جس طرح گھٹا ٹوٹ کے برستی ہے اسی طرح کی یہ بارش بھی ہے جو معشوق کی طرف سے ہورہی ہے۔یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جب گھٹا ٹوٹ کے برستی ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہوجاتا ہے ویسا ہی اندھیرا محبوب اپنی زلفوں سے کیے ہوئے ہے اور بالوں سے پانی برس رہا ہے۔اس شعر کا ایک اور مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ عاشق پر معشوق کا لطف وکرم آج بھی کچھ زیادہ ہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عاشق کو لگ رہا ہے کہ یہ میرا وہی محبوب ہے یا کوئی اور۔کیوں کہ آج جس قدر عنایت ہے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔اس عنایت پر عاشق حیرت کا اظہار کررہا ہے۔جس کا خیال ''کس''میں پوشیدہ ہے۔ ایک بات اور بھی ممکن ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی زلفوں کی بھی بالواسطہ تعریف کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

تیسرا شعر: آرزو نے اس شعر میں ''چڑھتا پانی'' کے محاورے سے مضمون آفرینی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔یہاں لڑکپن کی اٹھان کو چڑھتے ہوئے سورج کی مانند قرار دیا ہے۔جوانی میں آدمی ہوش کھو بیٹھتا ہے جو کہ چندروزہ ہے ایسی چیز جو فانی ہے چندروز کی ہے انسان اس پر بھی گھمنڈ کرنے لگتا ہے لیکن جیسے ہی جوانی کا سورج ڈھلان کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا اور اس کے چڑھتے پانی کا گھمنڈ ٹوٹ جاتا ہے اس لیے ایسی چندروزہ جوانی' ایسے چڑھتے سورج پر غرور کرنے سے کچھ نہیں حاصل ہونے والا۔لہٰذا انسان کو گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

چوتھا شعر: رس ہی رس یعنی پانی ہی پانی آنکھوں میں ہے مگر سیل یعنی بہاؤ اور سیل بمعنی مروت ان میں ذرا

بھی نہیں اس لیے ان آنکھوں کا مارا ہوا کہیں پانی نہیں مانگتا۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ رس ہی رس یعنی محبت، انسیت اس کا مطلب یہ ہوا کہ بظاہر ان آنکھوں میں محبت اور لگاؤ تو ہے لیکن حقیقت میں محبوب وفا، اور مروت ذرا بھی نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ اس کی آنکھوں کا مارا ہوا پانی نہیں مانگتا یا پانی نہیں پاتا۔

پانچواں شعر: آرزو کو زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ پوری غزل کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اچھی ریاضت کی تھی۔ کیوں کہ پانی سے متعلق محاورے اور "پانی" لفظ کا استعمال جتنی صورتوں میں ممکن تھا انہوں نے اس کا خوب سے خوب تر استعمال کیا ہے۔ پانی ردیف سے انہوں نے مضمون آفرینی کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ اس شعر میں آرزو کہتے ہیں کہ جب پھوٹ کے رولیں تو اب سینے میں جلن کیوں ہو رہی ہے؟ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جب آدمی دکھوں کو اپنے اندر ہی اندر لیے رہتا ہے تو اس کو اس کا درد ستاتا رہتا ہے۔ یعنی خلش اور جلن ہوتی رہتی ہے اور جب آدمی پھوٹ کے رو دیتا ہے تو اس کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس شعر کا معاملہ یہ ہے کہ اندر کی آگ کو پگھلا کر نکال دیا ہے۔ اس کے باوجود سینے میں جلن باقی ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی وفا اور محبوب کی بے وفائی اور اس کی بے التفاتی کو یاد کر کے عاشق پھوٹ پھوٹ کر رویا ہے۔ اس کے باوجود اس کے سینے میں ابھی جلن باقی ہے۔ اس شعر کو دیکھتے ہوئے میرؔ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ:

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

دراصل محبت کا معاملہ بھی یہی ہے کہ محبوب اپنے جی کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ محبوب کے ہاتھوں عاشق پر خواہ کتنے ہی ظلم کے پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ جائیں لیکن اگر عاشق سچا ہے تو وہ کبھی بھی اپنی راہ سے نہیں بھٹکے گا۔ یہاں چونکہ پھوٹ کر رونے کے باوجود جلن باقی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کا دل پھر محبوب کی توجہ کا تقاضا کر رہا ہے یہی زندگی کا فلسفہ ہے اور بس۔ چونکہ محبوب کی بے التفاتیوں، اس کے ظلم و ستم سے بھی عاشق کو ایک طرح لگاؤ محسوس ہوتا ہے اور اس میں بھی اس کو ایک طرح کا لطف حاصل ہوتا ہے اسی لیے عاشق کا دل ایک بار پھر شاید اسی جانب مائل ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. پہلی غزل کے تیسرے شعر میں ''ایک لگی'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

8. دوسری غزل کے دوسرے شعر کا مفہوم اپنی زبان میں لکھیے۔

9. ''جلتا پانی'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

3.7 خلاصہ

اب تک ہم نے اس باب میں آرزو لکھنوی کی حیات' ان کی شاعری کی خصوصیات اور دو غزلوں کا مطالعہ شرح کے ساتھ کیا۔ اس سے آپ کو آرزو کی زندگی' ان کی حیات' ان کے کارنامے اور شاعری کی جملہ خوبیوں کا اندازہ بخوبی ہو گیا ہوگا۔ آرزو لکھنوی زبان کے ان ماہرین میں سے ہیں جنھوں نے زبان کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی کاوشیں کی ہیں۔ شاعری میں خالص ہندوستانی زبان استعمال کرنے کا سہرا ان کے سر ہے حالانکہ انشاء اللہ خاں کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے ''رانی کیتکی کی کہانی'' دیسی زبان میں لکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک نے شاعری میں کمال دکھایا ہے تو دوسرے نے نثر میں۔ اس باب کے مطالعے کے بعد آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آرزو کے کلام کو مزید پڑھنے کی کوشش کریں گے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. آرزو کے دور اول کی شاعری کی خصوصیات لکھیے۔

2. پہلی غزل کے دوسرے' تیسرے اور چوتھے شعر کا خلاصہ کلام اپنی زبان میں لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. آرزو کی زندگی اور ابتدائی حالات قلم بند کیجیے۔

2. آرزو کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3. آرزو کی زبان کے بارے میں ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔

3.9 فرہنگ

اول شب	رات کا پہلا پہر' پہلا حصہ
لگی	لگن' محبت' عشق
وحدت	یگانہ ہونا' یہ ماننا کہ اللہ ایک ہے
پاشانی	چھڑکاؤ' جلوہ
دبستان	اسکول' مکتب
اصنافِ سخن	شاعری کی قسمیں جیسے غزل' مرثیہ' مثنوی وغیرہ
ریختی	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے۔
معاملہ بندی	معاملہ کرنا' مقصد حاصل کرنا' لین دین کرنا
انفرادیت	یکتا' اکیلا
کس بل	قوت' طاقت
طبع رسا	ذہین' تیز طبیعت
پُرگوئی	بہت کہنے' زیادہ کہنے کی صفت
عرفیت	مشہور نام' وہ نام جو لوگ پیار سے بلانے کے لیے پکارتے ہیں
رس	عرق' پانی

3.10 معاون کتابیں

1. فغانِ آرزو — آرزو لکھنوی
2. جہانِ آرزو — آرزو لکھنوی
3. بیانِ آرزو — آرزو لکھنوی
4. نشانِ آرزو — آرزو لکھنوی

5. سریلی بانسری — آرزو لکھنوی
6. متفرقاتِ آرزو — آرزو لکھنوی
7. بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں — مرزا جعفر حسین
8. تاریخ ادب اردو — سید اعجاز حسین

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. آرزو لکھنوی کا پورا نام سید انور حسین آرزو تھا۔
2. سریلی بانسری
3. ''متوالی جوگن'' اور ''دل جلی بیراگن''
4. آرزو کے دوسرے دور کی شاعری میں میرؔ اور مومنؔ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ میر کی زبان کا اثر تو ان کی پوری شاعری پر ہے۔
5. ''سریلی بانسری'' آرزو کے ان کلام کا مجموعہ ہے جن کو وہ خالص اردو کہتے ہیں۔ جس میں عربی فارسی کا کوئی بھی لفظ شامل نہیں ہے۔
6. تیسرے دور کی شاعری میں وہ غالبؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں فلسفہ اور تصوف کی طرف رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔
7. لگی یعنی محبت، لگن، عشق آرزو نے شمع کو لو لگانے کا ذکر کر کے اور پہلے مصرعے میں ''لگی'' رکھ کر نئی بات پیدا کر دی ہے کیوں کہ شمع کے شعلے کو اس کی ''لو'' کہتے ہیں اور ''لگی'' کا لفظ آگ کے لیے اور شوقِ دلی کے لیے بول جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ''میرے تو دل کو لگی ہے، تمہیں کیا پتا؟''
8. آج معشوق کا برتاؤ پہلے کی بہ نسبت ذرا سا الگ ہے کون ہے جو اس طرح بھیگے ہوئے بالوں سے پانی چھڑک رہا ہے اور اس قدر چھڑک رہا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گھٹا ٹوٹ کر برس رہی ہے۔
9. جلتا پانی سے یہ مراد ہے کہ دل میں جو آگ لگی ہے اس کی وجہ سے جو پانی آنکھوں سے نکل رہا ہے وہ گرم ہے۔

بلاک نمبر 2

اکائی 4.	مولانا حسرتؔ موہانی	67
اکائی 5.	فراقؔ گورکھپوری	88
اکائی 6.	ناصرؔ کاظمی	110

اکائی 4 : مولانا حسرتؔ موہانی

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد
4.2 تمہید
4.3 مختصر سوانح
4.4 حسرت کی ادبی خدمات
4.5 حسرت کی غزل گوئی
4.6 حسرت کی غزل (1)
4.6.1 غزل کا مجموعی تاثر
4.6.2 اشعار کی تشریح
4.7 حسرت کی غزل (2)
4.7.1 غزل کا مجموعی تاثر
4.7.2 اشعار کی تشریح
4.8 خلاصہ
4.9 نمونہ امتحانی سوالات
4.10 فرہنگ
4.11 معاون کتابیں
4.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ حسرتؔ موہانی کی حیات، ان کے جذبۂ حب الوطنی اوران کی ادبی خدمات سے آگہی

حاصل کریں گے۔ اور اس حصے کے مطالعہ کے بعد آپ غزل گوئی میں حسرتؔ کے مخصوص رنگ اور ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ اکائی کے آخر میں شامل حسرتؔ کی دو غزلوں کے تفصیلی مطالعہ سے نہ صرف آپ کی زبان فہمی میں اضافہ ہوگا بلکہ آپ کا ذہن کسی قدر غزل کی فضا سے ہم آہنگ ہو جائے گا۔

4.2 تمہید

ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ایک پرعزم اور صاف گو مجاہد کا نام تھا حسرتؔ موہانی۔ حسرتؔ صرف ایک محبّ وطن مجاہد ہی نہیں بلکہ ایک اچھے غزل گو شاعر بھی تھے۔ جنہوں نے غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کر دیا جب کہ ان کے عہد میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کی وجہ سے لوگ لکھنوی اور دہلوی طرز شاعری سے اکتا چکے تھے، لیکن انہوں نے دونوں دبستانوں کے اختلاط سے ایک نیا آمیزہ تیار کیا جس کو بجا طور پر رنگ حسرتؔ کہا جا سکتا ہے۔

4.3 مختصر سوانح

حسرتؔ موہانی کا نام ''سید فضل الحسن'' اور تخلص ''حسرتؔ موہانی'' تھا۔ ان کی پیدائش ضلع اناؤ، اتر پردیش کے ایک قصبہ ''موہان'' میں 81-1880ء کے قریب اور وفات 13 مئی 1951ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم قدیم وضع کے ایک مکتب میں ہوئی، جہاں ختم قران کے بعد انہوں نے فارسی اور عربی کا درس لیا اور 1894ء میں اردو مڈل کا امتحان اس اعزاز اور امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ پورے صوبے میں اول رہے۔ مڈل اسکول میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد، مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہ فتح پور چلے گئے۔ فتح پور کے گورنمنٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے فکر وسخن کی ابتداء کی۔ 1899ء میں انہوں نے گورنمنٹ اسکول سے ہی انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ان دنوں حسرتؔ کی عربی، فارسی اور ریاضی میں استعداد بہت نمایاں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد محمڈن اینگلو عربک کالج (موجودہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت

سے آچکے تھے۔ انٹرنس کا رزلٹ دیکھتے ہی ڈاکٹر موصوف نے حسرتؔ کو حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ آنے کی دعوت دے دی۔ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے حسرتؔ نے علی گڈھ میں داخلہ لے لیا۔ یہاں پر انہوں نے پروفیسر جے سی چکرورتی، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، اور صاحب زادہ آفتاب احمد خان وغیرہ سے درس لیا۔ علی گڑھ میں ان کے رفقاء میں سید سجاد حیدر یلدرم، مولانا شوکت علی، خان بہادر سید ابو محمد، پروفیسر ظریف دہروی، اور محمد حیات وغیرہ تھے۔ ان حضرات کے ساتھ شعر و سخن کی محفلیں اکثر گرم رہا کرتی تھیں۔ شعر و ادب کی خدمت کے ساتھ 1903ء میں انہوں نے علی گڈھ سے عربی اور ریاضی اختیاری مضامین کے ساتھ بی اے پاس کرلیا۔

قیام علی گڑھ کے دوران وہ سیاست اور آزادیٔ وطن کے جذبے سے اس قدر سرشار ہو چکے تھے کہ نعرۂ حریت بلند کرنے کے جرم میں وہ تین بار کالج سے نکالے گئے۔ ان کے جذبۂ حریت، بے باکی اور حق گوئی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بی اے کے امتحانات سے فرصت پاتے ہی، نتیجہ کا انتظار کیے بغیر، علی گڑھ سے ''اردوئے معلیٰ'' کا ڈکلریشن داخل کر دیا اور شہر میں منتقل ہونے کے بعد اردوئے معلیٰ کی ادارت میں مصروف ہو گئے۔ اس ماہنامے کا پہلا شمارہ جولائی 1903ء میں منظر عام پر آیا۔ اس جریدے نے نہ صرف اپنے عہد کے ادبی مذاق کو نکھارا بلکہ عوام میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا۔ اس لحاظ سے اردوئے معلیٰ ہندوستان کا پہلا اردو جریدہ ہے جس نے ملک میں سیاسی شعور، بالخصوص مسلمانوں میں سیاسی فہم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اردوئے معلیٰ میں جہاں ''مسلمان اور پالیٹکس''، ''مسلمان اور کانگریس'' اور ''ہندوستان کے پولیٹکل قیدی'' جیسے ہندوستانی سیاست سے متعلق مضامین شائع ہوئے، وہیں بین الاقوامی سیاست سے متعلق مضامین اس رسالے کی زینت بنے۔ بلکہ ایک مضمون، بعنوان ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' شائع کرنے کے سبب حسرت پر مقدمہ چلا اور انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ قومی اور بین الاقوامی سیاست کی فہم پیدا کرنے کے علاوہ اس جریدے نے ایک بڑا کام، مسلمانان ہند کو تحریک آزادی سے جوڑنے کا بھی کیا۔ وہ بھی ایسے ناسازگار ماحول میں جب مسلمانوں کے لیے آزادی اور کانگریس کی حمایت کفر کے مترادف تصور کی جاتی تھی۔ لیکن مولانا موصوف نے اپنے زور قلم اور اس ماہنامے کے توسط سے،

مسلمانوں کے لیے تحریک آزادی اور کانگریس میں شمولیت کی راہ ہموار کردی۔ اسی وجہ سے علی گڑھ کے صاحب اقتدار لوگوں نے اردوئے معلّٰی کی شدید مخالفت کی، یہاں تک کہ طلبائے علی گڑھ کے لیے یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ نہ تو وہ اردوئے معلّٰی کے خریدار بنیں اور نہ ہی حسرتؔ کی دکان پر جائیں۔

حسرت موہانی ممتاز شاعر و ادیب اور بے باک صحافی کے علاوہ ایک محبِ وطن سیاست داں بھی تھے۔ حب الوطنی سے سرشار ہوکر انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی۔ 1904ء سے 1907ء تک تو وہ کانگریس کے باقاعدہ، سرگرم رکن بھی رہے۔ 1904ء اور 1905ء کے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی رپورٹ اردوئے معلّٰی میں شائع کر کے انہوں نے، ایک لحاظ سے اردوئے معلّٰی کو کانگریس کا ترجمان بنا دیا۔ وطن کی محبت سے ہی مجبور ہو کر انہوں نے علی گڑھ میں ''موہانی سودیشی اسٹور'' اور بعد میں کانپور میں بھی سودیشی اسٹور کھولا۔ جب فرنگی جبر و استبداد کی بدولت انہیں جیل جانا پڑا تو اردوئے معلّٰی کے ساتھ علی گڑھ کا یہ اسٹور بھی بند ہو گیا۔ ذرائع معاش چھن جانے اور قید خانے کی اذیتوں کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لرزش نہیں آئی۔ اسیری کے باوجود نہ ہی انہوں نے راست گوئی اور بے باکی کو خیر باد کہا اور نہ ہی دامن ادب سے کنارہ کشی اختیار کی، جیسا کہ ایک شعر میں اپنی مشقتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جیل کی اذیتوں کے باوجود ان کے عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ جیل جانے سے جذبۂ حب الوطنی فزوں تر ہو گیا، جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر بڑے بڑے عہدہ داروں کی مخالفت کے باوجود، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ''مکمل آزادی'' کی قرارداد پیش کر دی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک کانگریس محض ''جزوی آزادی'' کے لیے کوشاں تھی۔ گویا مکمل آزادی کی قرارداد پیش کرنے والے حسرتؔ پہلے مجاہد آزادی تھے۔ سزائے قید نے بے باکی اور راست گوئی میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ بوقت

ضرورت کانگریس، گاندھی جی، محمد علی جناح اور سردار پٹیل کی برسرِ عام مخالفت سے باز نہیں آئے۔ ان کے فعال ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی تقریباً تمام اصلاحی، سیاسی اور فکری تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواہ وہ خلافت تحریک، ترکِ موالات کی تحریک، سائمن کمیشن کی مخالفت میں تحریک، 1917ء کے انقلاب روس کے زیر اثر شروع ہونے والی ہندوستان کی کمیونسٹ تحریک اور مزدوروں کی تحریک ہو یا پھر ترقی پسند ادبی تحریک اور علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک ہو۔ الغرض مولانا موصوف اپنے عہد کی تقریباً تمام تحریکات سے وابستہ رہے۔ حسرتؔ موہانی نے آزادیٔ ہند کے بعد تشکیل پانے والی دستور ساز اسمبلی میں بھی بحیثیت ممبر پارلیمنٹ کے شرکت کی لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے انہوں دستور ہند پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ مختصراً مولانا حسرتؔ موہانی گوناں گوں خصوصیات کے مالک، ایک کثیر الجہت شخصیت تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. حسرتؔ کا پورا نام کیا تھا؟
2. حسرتؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟
3. حسرتؔ علی گڑھ کالج سے کس جرم میں نکالے گئے تھے؟
4. حسرتؔ کے جاری کردہ مجلّہ کا نام لکھیے۔
5. کانپور سے حسرت نے کون سا روزنامہ اخبار جاری کیا تھا؟
6. حسرت کے رسالے سے ہندوستانی معاشرے بالخصوص مسلم معاشرے میں کون سی تبدیلی واقع ہوئی؟

4.4 حسرتؔ کی ادبی خدمات

حسرتؔ موہانی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے دو رسالے ''اردوئے معلیٰ'' اور ''تذکرۃ الشعراء'' علی گڑھ سے اور ایک روزنامہ اخبار ''مستقل'' کانپور سے جاری کیا۔ تذکرۃ الشعراء دراصل قدیم و جدید شعراء کے دواوین کا ایک انتخابی سلسلہ تھا، جو چند برس اردوئے معلیٰ کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا رہا اور

چند سال انفرادی حیثیت سے کتابی شکل میں۔ اس ضمیمے یا کتابی سلسلے میں مستند شعراء کے دواوین کے انتخاب کے علاوہ شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقید بھی شامل ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے تذکرۃ الشعراء کی اہمیت اردو ادب کی تاریخ کی بھی ہے۔ 1914ء میں حکومت برطانیہ کے جبر واستبداد کا شکار ہو کر اردوئے معلیٰ کی اشاعت موقوف ہو گئی۔ لیکن جیل سے رہائی ملنے کے بعد 1925ء سے حسرتؔ موہانی نے اردوئے معلیٰ کا سلسلہ کانپور سے دوبارہ شروع کیا جو 1934ء تک جاری رہا۔ کانپور منتقل ہونے کے بعد مولانا نے تذکرۃ الشعراء کی تمام جلدوں کو یکجا کر کے ''انتخاب سخن'' کے نام سے گیارہ جلدوں میں شائع کروایا، جو بلاشبہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

''نکات سخن'' حسرتؔ کی عملی تنقید کا نمونہ ہے۔ انہوں نے یہ کتاب نومشق شعراء کی رہنمائی کے لیے لکھی تھی۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان ''متروکات سخن'' دوسرا ''معائب سخن'' تیسرا ''محاسن سخن'' اور چوتھا ''نوادر سخن'' کے نام سے شائع ہوا اور پانچویں باب کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی۔ ان میں سے متروکات سخن، معائب سخن اور محاسن سخن بے حد مقبول ہوئے۔ ''مشاہدات زنداں'' ایک طرح سے حسرتؔ کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے قید فرنگ میں اپنی صعوبتوں اور انگریزوں کے مظالم کا ذکر بہت ہی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان کتابوں کی تصنیف کے علاوہ انہوں نے مختلف شعراء کے دواوین مرتب کیے اور دیوان غالب مع شرح مرتب کی۔ ان مستقل کتابوں سے قطع نظر مختلف رسائل وجرائد میں ان کے مضامین اور مقالے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تحریروں کے جائزے سے حسرتؔ کی شعر فہمی، زبان دانی، تنقیدی بصیرت اور فن تذکرہ نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختصراً حسرتؔ ایک بلند پایہ محقق، نثر نگار، صحافی اور شاعر تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

---

7. ''انتخاب سخن'' کی سلسلے وار اشاعت کس رسالے میں عمل میں آئی؟

8. مولانا حسرتؔ موہانی کے روزنامہ کا کیا نام تھا اور انہوں نے اسے کہاں سے جاری کیا تھا؟

9. ''مشاہدات زنداں'' کا مصنف کون ہے؟

10. ''مشاہدات زنداں'' کا موضوع کیا ہے؟

4.5 حسرتؔ کی غزل گوئی

انیسویں صدی کے ربع آخر میں، یعنی حسرتؔ کے سن شعور کو پہنچنے کے زمانے میں اردو غزل میں دو میلانات نمایاں تھے۔ ایک میلان لذت کوشی اور عیش پرستی پر منحصر، واقعیت کے مقابلے میں تخیل پسندی کے مرہون منت تھا۔ اس میلان کے نمائندہ غزل گو شاعر داغؔ دہلوی اور امیرؔ مینائی تھے۔ غزل کا دوسرا مقبول رجحان جدیدیت کا تھا، جس کی نمائندگی حالیؔ، اسماعیلؔ میرٹھی اور وحید الدین سلیمؔ وغیرہ کر رہے تھے۔ جدیدیت اور فطری شاعری کے اس رجحان نے بلاشبہ غزل کو باعتبار موضوع وسعت بخشی مگر اسلوب کے نقطۂ نظر سے اس قبیل کی بیشتر غزلیں سپاٹ، تخیل اور رمزی کیفیت سے محروم تھیں۔ عہد حسرتؔ میں ان دونوں مقبول رجحان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا رنگ بھی بڑی ہی آہستگی سے سرابھار رہا تھا۔ یہ تیسرا رنگ تھا شادؔ عظیم آبادی کا جن کی غزلوں میں بقول نیاز فتح پوری:

> ''بیان کی سادگی، نرم لب و لہجہ، سوز و گداز اور واقعیت، جنہیں تغزل کی جان کہا جاتا ہے، ان کے یہاں اس قدر دلکش اور معتدل انداز میں پائی جاتی ہے کہ اس کی مثال اس کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔''

حسرتؔ نے اسی رنگ تغزل کو اپنایا اور بام عروج تک پہنچا دیا اور غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو نیا وقار عطا کر دیا اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ حسرتؔ نے اردو غزل کا احیاء کر دیا۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

> ''بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اردو شاعری میں ایک اور نیا رجحان پیدا ہو گیا۔ آزاد خیال اور تربیت یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت یہ دیکھ کر کہ غزل کی ناؤ اب ڈوبنا چاہتی ہے، اس فکر میں ہوئی کہ اس کو بچا کر نئے اور صاف ستھرے دھارے پر لگا دیا جائے تا کہ وہ سلامتی کے کنارے پر پہنچ کر اپنی بقا اور ترقی کے نئے سامان مہیا کر سکے۔ اس جماعت کے امام حسرتؔ موہانی تھے۔

انہوں نے مرتی ہوئی اردو غزل کو نہ صرف از سرِ نو زندہ کیا بلکہ اس کو نیا وقار اور نئی جہت دی۔''

حسرتؔ کو غزل کی صالح روایات، اس کی قوت تسخیر اور کے بے شمار امکانات پر کامل یقین تھا۔ انہیں احساس تھا کہ غزل اس عہد میں بھی اپنے اشاروں کی بلاغت اور علامتوں کی معنی آفرینی کی وجہ سے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حسرتؔ نے اپنے تنقیدی خیالات کے ذریعہ غزل کی افادیت اور اہمیت واضح کی۔ غزل میں انقلابی اصلاحات کر کے اسے ایک پروقار لب و لہجہ عطا کیا اور اس کی ساکھ کو دوباری بحال کیا۔ ان کی غزلیں ان کے خیالات کا عملی ثبوت ہیں۔ یہی وجہ ہے کی حسرتؔ کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس گھٹن اور اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا جو بہت سے قدیم شاعروں کو پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔

حسرتؔ نے غزل گوئی کے میدان میں متقدمین کو یکسر نظر انداز نہیں کر دیا۔ نسیمؔ کے شاگرد ہونے کے باوجود انہوں نے تمام قدیم شعراء کے کلام سے استفادہ کیا اور ان کے فن کی بہترین خوبیوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کی۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے حسرتؔ کہتے ہیں:

حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام ۔۔۔ شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میرؔ
طبع حسرتؔ نے اٹھایا ہر اک استاد سے فیض ۔۔۔ غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ

حسرتؔ کا یہ اعتراف برحق ہے۔ ان کی غزلوں میں مصحفیؔ، مومنؔ اور میرؔ کے خیالات اور لب و لہجے کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر مصحفیؔ کی غزلوں کا احساس، رنگ اور نشاط آمیز کسک کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اساتذۂ سخن سے استفادہ کرنے اور رنگ سخن کا تتبع کرنے کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ حسرتؔ کی شاعری کورانہ تقلید اور قدیم شعراء کی صدائے بازگشت ہے اور اس میں اپج اور انفرادیت مفقود ہے۔ بلاشبہ حسرتؔ کی شاعری میں قدیم شعراء کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن یہ گونج اس آواز کو دبانے میں کامیاب نہیں ہو پاتی جو حسرتؔ کی اپنی منفرد آواز ہے۔ مجنوںؔ گورکھپوری اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حسرتؔ کے اندر بڑی شدید اور واضح انفرادیت بھی ہے۔ یعنی استادوں سے جو کچھ لیا اس کو اپنے

رنگ میں، جوخود بھی بہت تیز تھا رنگ لیا۔"

ایک اور تحریر میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اصلی مزاج اور اندرونی کیفیت کے لحاظ سے حسرتؔ کا ہر شعر چاہے وہ میرؔ و دردؔ کی یاد دلائے، چاہے غالبؔ و مومنؔ چاہے جرأتؔ و مصحفیؔ کی، اپنے اندر ایک شدید انفرادیت رکھتا ہے جس کو ہم حسرتؔ سے منسوب کر سکتے ہیں۔"

بیشتر غزل گو شاعروں کے مانند اور غزل کی مقبول عام روایت کے مطابق حسرتؔ کی شاعری میں بھی مرکزیت، موضوعات حسن و عشق کو حاصل ہے۔ لیکن ان کا تصور عشق قدیم غزل گو شعراء کے عشق سے یکسر مختلف ہے۔ ان کا عشق رسمی یا کسی بیمار ذہن کا عشق نہیں ہے۔ یہ ایک صحتمند ذہن کا عشق ہے جس کا اظہار غزل کی قدیم روایات کو نبھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے زندگی ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان کا عشق واضح طور پر ارضی اور مادی ہے، جس میں جنس کی مہک اور جسم کی خوشبو ہے۔ لیکن ان کا عشق لکھنوی شعراء کی طرح جنسی تلذذ اور ابتذال کی حدوں میں نہیں داخل ہوتا۔ حسرتؔ کی فطری شرافت اور مشرقیت ان کے عشق کو ایک نوع کی معصومیت اور پاکیزگی عطا کرتی ہے جس سے ان کے یہاں جسم کی پکار کے ساتھ روح کی آواز ہم آہنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے خارجی بیانات اور حسن کی مختلف کیفیات کی مصوری ہمارے ذہن میں وہ گھٹن نہیں پیدا کرتی جیسا کہ داغؔ اور جرأتؔ کے شعروں کو پڑھتے ہوئے ہوتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار جس میں عشق کی معصومیت، پاکیزہ محبت اور بھولے پن کی ایسی تصویریں پیش کرتی ہیں جس کی مثال اردو غزل میں کم ہی نظر آتی ہیں:

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

سوتے میں جو دیکھا تھا رخ یار کا عالم
آنکھوں میں یہ خنکی ہے اسی نور سحر کی

دل بیتاب کی بیتابیاں ہم سے کہتی ہیں
ذرا ہم بھی تو دیکھیں آپ کی شوخی کہاں تک ہے

یہ اشعار ہمیں اس لیے متاثر کرتے ہیں کہ ان میں نہ تو ماورائی عشق کا بیان ہے اور نہ ہی کسی ایسے معشوق کا تذکرہ ہے جو ہماری دنیا کے علاوہ کسی اور دنیا کا مخلوق ہو۔ مزید یہ کہ حسرتؔ حسن و عشق کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ بھری محفل میں آہستہ سے ہاتھ دبا دینے یا راستے میں ملنے پر ہونٹ کاٹنے کا تذکرہ وہی شاعر کرسکتا ہے جو عشق کے تجربات سے خود گزرا ہو۔ جو حسن کے جلوۂ صد رنگ کو آنکھوں کے دریچوں سے دل کی وادی میں تاڑ لینے کا ہنر جانتا ہو اور جو عشق کی گرمی اور اس کی کسک کو زندگی سے لے کر شعری سانچے میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہو۔ جو زندگی کے معمولی تجربات کو اپنے فن میں ڈھالنے کی ایسی صلاحیت رکھتا ہو کہ اشعار میں ایک نوع کی ہمہ گیری، اور دلوں میں اترنے اور گھلنے والی خوبیاں پیدا ہو سکیں۔ مثلاً

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جایئے — بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے
راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہ ستم — ہونٹ اپنا کاٹ کر مجھ سے جدا ہو جایئے
سر کہیں، بال کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں — ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو
زلف شب رنگ پہ گلنار لباسی کی بہار — آج حسرتؔ نے رخ یار میں کیا کیا دیکھا
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

حسرتؔ کی غزلوں میں غم کشی اور حرماں نصیبی کے بجائے ایک رجائیہ اور نشاطیہ لہر واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ دراصل حسرتؔ کو زندگی کے روشن امکانات پر اعتماد تھا۔ اس لیے ان کی زندگی اور شاعری میں مایوسی کے بجائے ایک طربیہ اور نشاطیہ آہنگ اور زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں پر اظہار رنج والم کے بجائے تبسم کی چاندنی چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شکر الطاف نہیں، شکوۂ بیداد نہیں — کچھ ہمیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں
اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم
میں ہوں وہ رضا جو کہ طبیعت مری حسرتؔ — ناکامی جاوید سے بھی شاد رہے گی

حسرتؔ کی عملی زندگی کے پس منظر میں، ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی غزلوں میں سیاسی افکار کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے اور غم جاناں کے مقابلے میں غم دوراں کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن جہاں کہیں حسرتؔ نے اشعار میں اپنے سیاسی افکار پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہاں جذبات کی شدت، عزم محکم اور ان کے عشق غیر مصلحت آمیز کی کارفرمائیاں ہم پر ایک دیرپا تاثر چھوڑ جاتی ہیں، نیز جہاں کہیں انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے رموز وعلائم کا سہارا لیا ہے وہاں یہ اثر انگیزی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ حسرت کے ان رموز وعلائم کے پس پشت ایک وسیع پس منظر موجود ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیں:

کیا سمجھتا ہے اسیران قفس کو صیاد　　دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

نظر میں پھر گئیں کیفیتیں سب عہد ساقی کی　　بھر آئے اشک خوں نظارہ مینائے خالی سے

انکار اور ایک جرعہ صہبا سے بھی انکار　　ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یوں ہی سوزش حب وطن تمام

حسرتؔ کی غزلوں کی کامیابی کا راز صرف ان کے موضوعات، ان کے جذبے کی صداقت اور ان کے خلوص و سادگی میں ہی مضمر نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی حد تک ان کے اس لب ولہجہ کا بھی ہاتھ ہے جس میں ایک کلاسیکی رچاؤ اور قدیم شعراء کی آوازوں کی گونج موجود ہے۔ قدیم شعراء سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھنؤ اور دہلی دونوں دبستانوں کے شعراء کی فنی خوبیوں کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ جیسا کہ وہ اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود　　تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہوگیا

حسرتؔ نے دہلوی اور لکھنوی شاعری کی صرف صحت مند عناصر کو اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔ انہوں نے لکھنوی شعراء سے زبان کا لوچ اور نرمی ولطافت لی لیکن لفظی بازی گری اور بے جا تکلف وتصنع سے احتراز کیا۔ اسی طرح دبستان دہلی کے شعراء سے جذبے کی گرمی اور ان کے خلوص وصداقت کے اثرات قبول کیے۔ لیکن ان کے لہجے کی مایوسی سے اپنی غزلوں کو محفوظ رکھا۔ ان دونوں دبستانوں کے مثبت عناصر کے امتزاج سے ان کی غزلوں میں ایسا فنی

رچاؤ، سادگی و پرکاری، شادابی اور نشاطیہ کیفیت اور طرز ادا کی ایسی حسن کاری آگئی، جس نے ان کی غزلوں اور اسلوب کو منفرد بنادیا۔ اثر لکھنوی کے لفظوں میں:

''حسرت کی شاعری میں لکھنؤ کی زبان اور متقدمین و متوسطین شعرائے دہلی کے تخیل کا بہترین امتزاج ہے۔''

اور بقول نیاز فتحپوری:

''حسرت کی غزل کا نرم ولطیف انداز بیان، الفاظ کی شیرینی، فارسی ترکیبوں کی حلاوت اور متوازن خیالات سے پیدا ہونے والی ہم آہنگی، یہ سب مل کر کچھ ایسی چیزیں بن جاتی ہیں جو ہمیں اس وقت کسی اور کے کلام میں نہیں ملتیں۔''

کلاسیکی شعراء کے مطالعے کے ساتھ ساتھ حسرت کے احساس جمال اور ان کی تخلیقی قوت نے انہیں قدیم الفاظ وتراکیب ہی پر اکتفا کرنے نہیں دیا بلکہ انہوں نے بہت سی ایسی ترکیبیں بھی تراشیں جو اردو شاعری میں رائج ہو گئیں اور بہت سی تراکیب، استعارات وتشبیہات نئے انداز میں اس طرح استعمال کیے کہ ان کی معنویت دو چند ہوگئیں۔ حسرت کی انتخابی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان اس تخلیقی قوت نے ان کی غزلوں کو کلاسیکی حیثیت کے ساتھ ساتھ شاعری کے نئے رجحانات اور نئے زاویوں کا نقیب بنادیا۔ آل احمد سرور کے لفظوں میں:

''حسرت نہ صرف ایک قدیم روایت عظمیٰ کی آخری یادگار ہیں بلکہ اردو غزل میں برائے نام جو کچھ نئی تحریک کے اثر پائے جاتے ہیں اس کے موجد یہی ہیں۔ اردو غزل کی نئی نسل کی ابتداء حسرت سے ہی ہوتی ہے۔ حسرت اردو غزل کی تاریخ کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

11. حسرت کی غزلوں کی فضا مایوسانہ ہے یا نشاطیہ؟
12. حسرت کے چند ایسے اشعار لکھیے جن میں محبوب کے ناز وانداز کا ذکر ہو۔

13. حسرتؔ کے چند ایسے اشعار لکھیے جن سے ان کی وطن دوستی، اسیری، اور انگریزوں کے ظلم وستم کا اندازہ ہوتا ہو۔

14. حسرتؔ کی غزلوں میں مرکزیت کس موضوع کو حاصل ہے؟

15. حسرتؔ شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

16. حسرتؔ نے کس غزل گو شاعر کے رنگ کو اپنایا؟

4.6 حسرتؔ موہانی کی غزل (1)

نگاہِ ناز، جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے؟

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے تو شامل اربابِ امتیاز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے، جو سرفراز کرے

4.6.1 غزل کا مجموعی تاثر

اس غزل کی سلاست اور سادگی قابلِ ذکر ہے۔ باعتبار موضوع یہ غزل عشق اور عشق کی وجہ سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیات، احساسات اور افکار کا احاطہ کرتی ہے۔ واضح رہے کہ عشق کو صوفیانہ مسلک میں خاص مقام حاصل ہے اور حسرتؔ ایک صوفی خانوادے سے بیعت تھے۔

4.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: ناز بھری نگاہیں یعنی محبوب کی نگاہیں جسے اپنے راز سے آشنا کرے، ایسا شخص اپنی خوش بختی پر

کیوں نہ ناز کرے۔ واضح رہے کہ آشنائے راز یا اپنے راز میں اسی کو شریک کیا جاتا ہے جس سے تعلق خاطر ہو۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جس پر اس کے محبوب کی نگاہ التفات ہو، جس کو محبوب کے محرم راز ہونے کا شرف حاصل ہو اس کا اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا بجا ہے۔

دوسرا شعر: محبوب کی محبت جو اپنی شدت کی وجہ سے جنون کی حد میں داخل ہوگئی تھی، نے ہمیں دونوں جہان کی فکر سے آزاد کر دیا۔ خدا کرے کہ ترے جنون کا یہ سلسلہ یعنی تری محبت کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جائے اور محبت کی یہ شدت تا دیر قائم رہے۔

تیسرا شعر: محبوب کے حسن کرشمہ ساز یعنی بے مثال حسن کی وجہ سے خرد یعنی دانائی اور عقلمندی کا نام جنون اور جنون کا نام خرد پڑ گیا ہے، یعنی محبوب کے بے مثال حسن کی وجہ سے میں جنون عشق میں مبتلا ہو گیا اور عشق کرنا عین دانائی اور عقلمندی ہے جبکہ لوگ عشق کو جنون اور دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں گویا لوگوں کی نظر میں عشق جنون اور دیوانگی ہے اور شاعر کے نزدیک عقلمندی ہے۔

چوتھا شعر: محبوب کے ظلم وستم سے میں اس لیے خوش ہوں کہ مسلسل ظلم وستم برداشت کرنے کی وجہ سے کسی روز تو محبوب کو میرے اوپر ترس آجائے گا اور وہ مجھے بھی ارباب امتیاز یعنی اپنے خاص لوگوں میں شامل کرلے گا۔

پانچواں شعر: گرچہ میں تیری نگاہ کرم اور عنایتوں ونوازشوں کا مستحق نہیں ہوں پھر بھی اگر تو چاہے تو مجھے کامیابی سے ہمکنار کر دے۔ گویا یہ شعر ذات باری کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ گرچہ اپنے گناہوں کی وجہ سے میں تیری نوازشوں کا مستحق نہیں لیکن چونکہ تو معاف کرنے والا ہے لہٰذا تری ذات سے امیدیں رکھنا غلط نہیں ہے میری غلطیوں کے باوجود اگر تو چاہے تو میری کوتاہیوں سے درگذر کر کے کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ وہیں اس شعر میں لفظ ''تو'' کا مرجع محبوب بھی ہوسکتا ہے۔ واضح رہے کہ ایک ہی شعر میں متعدد معنی کے امکانات شعر کا حسن تصور کیا جاتا ہے۔

4.7 حسرت موہانی کی غزل (2)

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں! کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں، اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرتؔ! ترے ترک محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

4.7.1 غزل کا مجموعی تاثر

اس غزل کی سادگی نہ صرف زبان کی سطح تک محدود ہے بلکہ فکر و خیال کی معصومیت بھی قابل ذکر ہے۔ پچھلی غزل کے مانند یہاں بھی عشق، سرور عشق اور اس سے گہری وابستگی شاعر کی فکر کا مرکز و محور ہے۔

4.7.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: میں اپنے محبوب کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی اس کی یاد میرا دامن نہیں چھوڑتی۔ یا الٰہی ترک محبت کے باوجود اس کی یاد میرے دل سے کیوں نہیں جاتی۔ یعنی محبت اور ترک محبت میں شعور کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ شاعر نے شعوری طور پر ترک محبت کا تہیہ کرلیا لیکن جذبۂ محبت کی صداقت کی وجہ سے ترک محبت میں کامیاب نہیں ہوتا۔

دوسرا شعر: اے دوست شراب صبح کی لذت و کیفیت کے افسانے مت چھیڑ کیونکہ تمہارے ان افسانوں کی وجہ سے میرے اندر وہ یادیں تازہ ہوجاتی ہیں جب میں شراب خودی سے مخمور تھا۔

تیسرا شعر: وائے حسرت، وائے ناکامی! آج کل ہم ہوش کی قید میں رہتے ہیں، یعنی ان دنوں ہمارے اوپر محبت کا جنون طاری نہیں ہے۔ ہوش و ہواس کی حالت میں ہمیں وہ دشت فراموشی یعنی جنون عشق اور راہ عشق کی سرمستی یاد آتی ہے۔

چوتھا شعر: جب محبوب کی یاد نہیں آتی تو برسوں نہیں آتی ، لیکن جب کبھی ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تو ان کی یاد اکثر آتی رہتی ہے۔

پانچواں شعر: اے حسرت تمہارے ترک محبت کی حقیقت کھل گئی اس لیے کہ ترک محبت کے بعد اس کی یاد اب پہلے سے کہیں زیادہ آتی ہے۔ یعنی جذبۂ محبت اس قدر بے لوث ہے کہ ترک محبت کی شعوری کوشش کے بعد محبوب اور بھی زیادہ یاد آنے لگا ہے۔

4.8 خلاصہ

ممتاز شاعر و ادیب، بے باک صحافی اور محبِّ وطن سیاست داں حسرتؔ موہانی کی پیدائش موہان میں 1980-81ء کے قریب ہوئی تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' اور ایک روز نامہ اخبار ''مستقل'' کانپور سے جاری کیے۔ تحریک آزادی کی حمایت اور حب الوطنی کی وجہ سے انہیں جیل کی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن سزائے قید سیری کے باوجود نہ تو انہوں نے سیاست سے توبہ کی اور نہ ہی شعر و ادب سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ شعراء کے تذکرے مرتب کیے، شاعری کے رموز و نکات پر ''نکات سخن'' لکھی اور بہت سارے ادبی سیاسی اور معاشرتی مضامین لکھے۔ اردو غزل کو ان کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے دبستان دہلی اور دبستان کے مثبت عناصر کو باہم ملا کر اپنی غزلوں کا خمیر تیار کیا اور وہ غزل جس کو نا قابلِ اعتناء سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تھا، اس کو پھر سے مقبول بنا دیا۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. حسرتؔ موہانی کی مختصر سوانح لکھیے۔
2. حسرتؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے:

1. حسرتؔ موہانی پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2. حسرتؔ کی غزل گوئی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

3. درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے، جو سرفراز کرے

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں، اے وائے **ناکامی**
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

4.10 فرہنگ

فزوں تر	اور زیادہ ہونا، اضافہ ہونا
فکر جمع افکار	غور، سمجھ
سخن	شاعری، بات، کلام
سرشار	مست، نشے میں چور، مخمور
حریت	آزادی
حق گوئی	سچ بولنا
صعوبتوں	مشکلات
مترادف	ہم معنی
شمولیت	شامل ہونے کا عمل

جبرواستبداد	ظلم وستم
ذرائع معاش	روزی روٹی کا ذریعہ، کمائی کا ذریعہ
استقلال	استحکام، مضبوطی، مستقل مزاجی
لرزش	لڑکھڑاہٹ
اسیری	قید
راست گوئی	سچ بولنا
کنارہ کشی اختیار کرنا	دوری اختیار کرنا
جزوی آزادی	ادھوری آزادی
تشکیل پانا	بننا
دستور ساز	قانون بنانے والی
دواوین	دیوان کی جمع ہے
ضمیمہ	وہ شئے جو کسی کے ساتھ بڑھا کر لگائی جائے، اخبار ورسائل کے اضافی صفحات
گراں قدر	قیمتی
متروکات	ترک کیے ہوئے
معائب	خامیاں، کمیاں
زنداں	جیل خانہ
وسعت	پھیلاؤ
معتدل	درمیانی درجے کا، متوسط
احیاء	دوبارہ زندہ کرنا

جہت	سمت
قوت تسخیر	مسخر کرنے کی طاقت
متقدمین	متقدم کی جمع، اگلے زمانے کے
اعتراف	اقرار
نشاط	خوشی
منفرد	علیحدہ، اکیلا، نمایاں
ابتذال	اخلاقی پستی، ہلکاپن
ہم آہنگ ہونا	مل جانا
نوع	قسم
حرماں نصیبی	بدقسمتی
رجائیہ	امیدوالی
تبسم	مسکراہٹ
عروج	بلندی
جرعہ	گھونٹ
صہبا	شراب، صبح کی شراب
مینا	صراحی
جور	ظلم
صداقت	سچائی
مضمر	پوشیدہ، چھپا ہوا

احتراز کرنا	بچنا
موجد	ایجاد کرنے والا
عالم	دنیا، کیفیت
دراز کرنا	لمبا کرنا، طویل کرنا

4.11 معاون کتابیں

1. حسرتؔ موہانی حیات اور کارنامے — ڈاکٹر احمر لاری

2. حسرتؔ موہانی — عبدالشکور

4.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. حسرتؔ موہانی کا پورا نام ''سید فضل الحسن'' اور تخلص ''حسرتؔ'' تھا۔
2. حسرتؔ کی پیدائش ضلع اناؤ، اتر پردیش کے ایک قصبہ ''موہان'' میں ہوئی تھی۔
3. حسرتؔ نعرۂ حریت بلند کرنے کے جرم میں علی گڈھ کالج سے نکالے گئے تھے۔
4. ماہنامہ ''اردوِ معلّیٰ''
5. روزنامہ مستقل
6. حسرتؔ کے رسالے نے ہندوستانیوں میں سیاسی فہم پیدا کی اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے تحریک آزادی اور کانگریس میں شمولیت کی راہ ہموار کی۔
7. ''انتخابِ سخن'' کی سلسلے وار اشاعت ''اردوِ معلّیٰ'' میں عمل میں آئی۔
8. مولانا حسرتؔ موہانی کے روزنامہ کا نام ''مستقل'' تھا جس کو انہوں نے کانپور سے جاری کیا۔
9. ''مشاہدات زنداں'' کے مصنف حسرتؔ موہانی ہیں۔

10. ''مشاہدات زنداں''ایک طرح سے حسرتؔ موہانی کی آپ بیتی ہے،جیلوں میں قید ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم بطور خاص اس کتاب کا موضوع ہے۔

11. حسرت کی غزلوں کی فضا نشاطیہ ہے۔

12. سوتے میں جو دیکھا تھا رخ یار کا عالم　　آنکھوں میں یہ خنکی ہے اسی نور سحر کی
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرح داری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

13. اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یوں ہی سوزش حب وطن تمام
کیا سمجھتا ہے اسیران قفس کو صیاد　　دل ہلا دیں جو کبھی درد سے فریاد کریں

14. حسرتؔ کی غزلوں میں موضوعات حسن وعشق کو مرکزیت حاصل ہے۔لیکن ان کا تصور عشق،قدیم غزل گوشعراء کے عشق سے یکسر مختلف ہے۔

15. حسرتؔ شاعری میں نسیم کے شاگرد تھے۔

16. ابتداء میں گرچہ حسرتؔ نے شاد عظیم آبادی کے رنگ تغزل کو اپنایا،تاہم انہوں نے تمام اساتذۂ کلام کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کیا جس کا اقرار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

شیرینیِ نسیمؔ ہے سوز و گداز میرؔ　　حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام
غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ　　طبع حسرتؔ نے اٹھایا ہر اک استاد سے فیض

اکائی 5 : فراقؔ گورکھپوری

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد
5.2 تمہید
5.3 مختصر سوانح
5.4 ادبی خدمات
5.5 فراقؔ کی غزل گوئی
5.6 فراقؔ کی غزل (1)
5.6.1 مجموعی تاثر 5.6.2 اشعار کی تشریح
5.7 فراقؔ کی غزل (2)
5.7.1 مجموعی تاثر 5.7.2 اشعار کی تشریح
5.8 خلاصہ
5.9 نمونہ امتحانی سوالات
5.10 فرہنگ
5.11 معاون کتابیں
5.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم فراقؔ گورکھپوری کی مختصر سوانح، اردو سے ان کی محبت، ان کی ادبی خدمات اوران کی شعری خصوصیات وغیرہ پر غور کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ یہ جان جائیں گے کہ رگھوپت سہائے فراقؔ

گورکھپوری کون تھے؟ اُن کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟ اور اُنہیں اُردو ادب میں کیا مقام حاصل ہے؟ آپ اُن کی دو مشہور غزلوں کا بھی مطالعہ کریں گے۔

5.2 تمہید

جب اردو کے شیدائیوں کا نام لیا جائے گا تو اس فہرست میں فراقؔ کا نام بھی ضرور شامل ہوگا۔ گرچہ وہ انگریزی ادب کے استاد تھے اور ایک ہندو خانوادے میں پیدا ہوئے، پھر بھی اردو سے ان کی بے پناہ محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنا سارا تخلیقی کام اردو میں ہی کیا۔ انہوں نے اردو زبان کو مقامی رنگ عطا کیا اور اردو ادب کو قدیم ہندوستانی اور مغربی ادب کے تجربات، روایات اور احساسات سے مالا مال کر دیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا۔ انہوں نے اُردو غزل کو فکر کا نیا انداز دیا اور اسے ایک اچھوتے اسلوب سے روشناس کرایا۔

5.3 مختصر سوانح

فراقؔ گورکھپوری کا پورا نام رگھوپت سہائے اور تخلص فراقؔ گورکھپوری تھا۔ ان کے والد گورکھ پرساد سہائے عبرتؔ کا شمار گورکھپور کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ عبرتؔ کی فارسی اور اردو کی لیاقت نہایت عمدہ تھی۔ پیشے سے وکیل تھے لیکن شعروسخن سے خاص شغف تھا۔ ان کے مورث اعلی بنواری لال سہائے شیر شاہ کے عہد میں کسی مقام سے منتقل ہو کر بنوار پار میں آباد ہو گئے تھے۔ بنواری لال کی نسبت سے اس گاؤں کا نام بنوار پار قرار پاتا ہے۔ بنوار پار کے اسی کائستھ خاندان میں فراقؔ کی ولادت 1896ء میں میں ہوئی۔ فراقؔ کا بچپن بہت اچھا گزرا۔ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بچپن میں ہر طرح کی سہولیات حاصل تھیں۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی فراقؔ کے خاندان کا ایک پس منظر تھا۔ والد عبرتؔ کے علاوہ پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحرؔ بھی شاعر تھے اور فراقؔ کے چچا ہٹی پرساد سہائے ہندی کے ادیب تھے۔ بطور مجموعی ابتدائی تعلیم اور تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے بہت صحت مند تھا۔

گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورکھپور کے مڈل اسکول اور مشن اسکول گورکھپور (موجودہ 'جبلی انٹر کالج') میں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں انہوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے ایف اے کیا۔ اسی دوران ان کی شادی ہوگئی جو ناکام ثابت ہوئی۔ بقول فراؔق ان کی شادی ان کے لیے ایک حادثہ تھی۔ جس کا المیہ نظم ''ہنڈولا'' میں یوں رقم ہے ؎

سیاہ ہوگئی دنیا مری نگاہوں میں
وہ جس کو کہتے ہیں شادی خانہ آبادی
مرے لیے ہوئی شادی خانہ بربادی
لٹا سہاگ میری زندگی کا مانڈو میں

شادی کی ناخوشی اور الجھنوں کے باوجود انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے کسی طرح بی اے پاس کرلیا۔ ابھی بی اے کے امتحانات سے فارغ ہوکر گورکھپور لوٹے ہی تھے کہ والد عبرؔت دارفانی سے کوچ کر گئے۔ والد کے انتقال کی وجہ سے وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے۔ جو کچھ بچا تھا وہ والد کی بیماری کی نذر ہوگیا۔ مجبوراً انہیں نہ صرف اپنا تعلیمی سلسلہ ترک کر دینا پڑا بلکہ اپنا آبائی مکان ''لکشمی بھون'' بھی فروخت کرنا پڑا۔ لیکن اسی زمانے میں انگریزی سرکار نے انہیں ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کرلیا۔ ان مشکل حالات میں یہ سروس ایک نعمت تھی لیکن ابھی انہوں نے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ سنبھالا بھی نہ تھا کہ جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے متاثر ہوکر، احتجاجاً اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور خود کو تحریک آزادی کے لیے وقف کردیا۔

1920ء میں جب پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے آئے تو گاندھی جی کی قیادت میں اس دورے کا بائیکاٹ کرنے والوں میں فراؔق بھی شامل تھے۔ بہت سارے لوگوں کی گرفتاری عمل میں آئی اور جیل میں ہی ایک برائے نام کاروائی کے بعد فیصلہ سنا دیا گیا۔ جس میں اور لوگوں کے ساتھ فراؔق کو بھی ڈیڑھ سال قید اور پانچ سو روپئے کی سزا ہوئی۔ دیگر قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کے اندر بھی فراؔق اور ان کے ساتھیوں

نے شعروادب کی شمع روشن رکھی۔ بہرحال جیل سے رہائی کے بعد، نہرو کی ایما پر انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی ذمہ داری سنبھال لی۔ چند برس انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد، نہرو کے سفر یورپ پر روانگی سے قبل یعنی 1927ء میں ''لکھنؤ کرشچن کالج'' میں ان کا تقرر بحثیت استاد ہوگیا۔ تقریباً ایک سال لکھنؤ میں کام کرنے کے بعد، کانپور کے سناتن دھرم کالج میں اردو اور انگریزی کے استاد کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ 1930 میں انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایم اے کرنے کے بعد 1930ء ہی میں الہ آباد یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوگیا۔ جہاں انہوں نے ریٹائرمنٹ یعنی 1958ء تک تدریسی فرائض انجام دیئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یو جی سی نے انہیں نیشنل ریسرچ پروفیسر مقرر کیا جس پر وہ 1966ء تک کام کرتے رہے۔

فراقؔ کی وفات 3 مارچ 1982ء میں دہلی میں ہوئی۔ یہاں وہ اپنی آنکھوں کا آپریشن کرانے گئے تھے۔ گرچہ آپریشن کامیاب رہا مگر ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ چونکہ جسمانی اعتبار سے وہ کافی کمزور ہو چکے تھے، عمر بھی زیادہ تھی، ان پر دل کا دورہ پڑا اور انتقال فرما گئے۔ ان کی نعش ایک مخصوص ٹرین کے ذریعہ الہ آباد لائی گئی اور سنگم پر ان کا کریا کرم سرکاری اعزاز کے ساتھ کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. فراقؔ کا پورا نام لکھیے۔
2. فراقؔ کہاں پیدا ہوئے تھے؟
3. فراقؔ کس سرکاری نوکری کے لیے نامزد ہوئے تھے؟
4. فراقؔ کس یونیورسٹی میں اور کس مضمون کے استاد تھے؟

5.4 ادبی خدمات

فراقؔ گورکھپوری انگریزی کے استاد تھے، مگر انہوں نے سارے تخلیقی کام اردو میں کیے۔ اردو کی وجہ سے ہی

انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: مشعل، شعلہ ساز، گل نغمہ، دھرتی کی کروٹ، چراغاں، پچھلی رات، گل بانگ، روپ، ہزار داستان، شعرستان، شبنمستان، غزلستان وغیرہ۔ ان کے نثری کارنامے میں اندازے، اردو کی عشقیہ شاعری، حاشیے، من آنم وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندی میں بھی انہوں نے ایک کتاب بعنوان اردو ساہتیہ کا اتہاس لکھی جو ہندی داں طبقے میں خاصی مقبول ہوئی۔

فراقؔ نے غزلوں کے علاوہ بہت سی کامیاب نظمیں بھی لکھیں، جن میں پرچھائیاں، ہنڈولا اور آدھی رات اور جگنو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں سے ان کی فطرت پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو نظم کو ان کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ہندوستانی مزاج اور رنگ میں رنگ دیا، نیز 1944ء میں پہلی بار اپنی نظم ''آدھی رات'' میں ''آزاد تلازمۂ خیال'' کی تکنیک کو استعمال کر کے اردو نظم کو وسعت بخشی۔ اس تکنیک کو میرا جی (ثناء اللہ خان ڈارؔ) کی طرح محض تحلیل نفسی کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے، انہوں نے بھرپور سماجی معنویت اور جمالیاتی ربط کے ساتھ استعمال کیا۔ اس نظم میں آدھی رات کا پورا منظر ہی سامنے نہیں آتا بلکہ ان نظم میں تاریکی، خاموشی اور سناٹے کو توڑتی ہوئی دور سے آتی ہوئی کسی گزرنے والی سواری کے گھنگروؤں کی آواز، رات کی رانی کی مہک، خوشبو کی لپٹ اور اس عہد کے ذہین انسان کے ذہن سے گزرنے والے خیالات، سب ہی کچھ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مختصراً فراقؔ اردو کے ان نمائندہ نظم گو شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے صنف نظم میں افکار، اسالیب، بحور اور ساخت کے نت نئے تجربے کیے۔

فراقؔ کی رباعیاں اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی رباعیوں کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ پہلی بار اردو رباعیوں میں ہندو گھرانوں کی عکاسی ہوئی ہے۔ ان رباعیوں میں انہوں نے جسم کی عرفانیات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندو تصور کے مطابق جسم اور مادہ مقدس ہے اور ان میں بھی ایک نوع کی پاکیزگی موجود ہے۔ یہی تصور ان کی رباعیوں کا پس منظر اور مرکزی موضوع ہے۔ ان کی رباعیوں میں آنگن میں تلسی کے پودے کو پانی دینے والی سہاگنوں کی تصویریں بھی ہیں اور گج گامنی ایسی چال والی کامنیاں بھی۔ محض ہندو گھرانوں

کی تصویروں کے سبب ان رباعیوں کی اہمیت نہیں، بلکہ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق اس میں اس آفاقی کلچر اور عالمی فکر کی پرچھائیاں بھی ہیں جو قدیم ہندوستان کے طرز حیات میں جلوہ گر ہوئی تھیں اور جس نے مصوری، مجسمہ سازی، سنگیت اور ادب؛ الغرض سبھی فنون لطیفہ کو ایک وحدت میں پرو دیا تھا۔ بطور مثال یہ رباعیاں دیکھیں:

پنگھٹ پہ گاگر چھلکنے کا رنگ
پانی ہچکولے لے کے بھرتا ہے رنگ
کاندھوں پر سروں پر دونوں ہاتھوں میں کلس
مدھ بھری انکھڑیوں میں سینوں میں بھرپور رنگ

وہ گایوں کا دوہنا، سہانی صبحیں
گرتی ہوئی بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم
یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہیں کرنیں

شاعر کے علاوہ فراقؔ ایک منجھے ہوئے نثر نگار اور نقاد بھی تھے۔ مختلف تنقیدی مضامین کے علاوہ ان کے وہ مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں جو انہوں نے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے حوالے سے لکھے۔ اس معاملے میں ان کا ذہن بالکل صاف تھا۔ انہیں اردو سے بے پناہ محبت تھی اور انہیں یہ گوارہ نہ تھا کہ اس خوبصورت زبان کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کر دیا جائے۔ اردو کی حمایت میں لکھی گئی اس تحریر کو دیکھیے:

"تو ہم اس اردو کے طرفدار ہیں کہ ہم تاریخ سے لڑنا نہیں چاہتے، تاریخ سے لڑنا اپنے آپ کو مٹانا ہے۔ کھڑی بولی کو مانجھنے اور سنوارنے میں مسلم مڈل کلاس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اب ہمارا کارنامہ یہ ہے کہ ہم مسلمان سے اچھا لکھ کے دیں جو پریم چند نے کیا۔"

تاہم ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا اور اردو زبان و ادب کو نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ جس کے لیے فراؔق کو ان کی زندگی میں ہی متعدد انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ 1931ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا، 1967ء میں پدم بھوشن سے نوازے گئے۔ اسی سال حکومت روس نے انہیں اعزاز اور انعام عطا کیا۔ 1970ء میں انہیں دو بڑے اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا یعنی ساہتیہ اکادمی نے انہیں اپنا فیلو مقرر کیا اور گیان پیٹھ نے بلند ترین ملکی انعام ''گیان پیٹھ'' سے نوازا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

5. فراؔق کے پانچ مجموعوں کے نام بتائیے۔

6. فراؔق کو کس سن میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا؟

7. فراؔق کی رباعیوں کا مرکزی موضوع کیا ہے؟

8. فراؔق کی چند نظموں کے نام لکھیے۔

9. کس ادارہ نے اور کب فراؔق کو اپنا فیلو مقرر کیا؟

5.5 فراؔق کی غزل گوئی

فراؔق گورکھپوری نے جس شعری ماحول میں قلم اٹھایا اس وقت امیؔر مینائی اور داؔغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ فراؔق کے استاد وسیؔم بھی امیؔر کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اس لیے فراؔق کا امیؔر مینائی کے اثرات قبول کر لینا فطری عمل تھا۔ چنانچہ فراؔق کی ابتدائی غزلوں میں داؔغ اور امیؔر کے اثرات بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اثرات کم و بیش 1940ء تک کی غزلوں پر واضح ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے بدلتی ہوئی قدروں اور فضا کو محسوس کر لیا، غزل کے جدید تر رجحانات پر غور کیا اور غزل کے نئے امکانات کی تلاش و جستجو میں مصروف رہے۔ اس دوران، یعنی 1940ء تک پہنچتے پہنچتے امیؔر مینائی اور داؔغ دہلوی کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا اور لوگوں کی نظریں عزؔیز اور صفؔی لکھنوی کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ دوسری جانب حاؔلی کی کوششیں بھی برگ و بار لا رہی تھیں۔ ان اسباب کی وجہ

سے فراقؔ کی دور اول، یعنی 1940ء تک کی غزلوں میں متعدد اور مختلف استاد شعراء کے رنگ، اسلوب اور طرز فکر کا احساس ہوتا ہے۔ تاہم اس پندرہ بیس سال کے عرصے میں غزل کے کسی ایک رنگ پر ٹھہرنے کے بجائے، وہ ایک منفرد اور ذاتی آواز کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہے۔ کبھی میرؔ کی جانب جھکے تو کبھی مومنؔ اور مصحفیؔ کی طرف۔ اسلوب احمد انصاری کے لفظوں میں:

> ''فراقؔ کی ابتدائی شاعری میں کئی اردو شاعروں کا رنگ جھلکتا ہے، جن میں مومنؔ، مصحفیؔ اور امیر مینائی قابل ذکر ہیں۔''

دوسرے لفظوں میں فراقؔ نے حسرتؔ کی طرح ہر استاد شاعر سے کسب فیض کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ ان کے کلام میں دردمندی، سوز و گداز اور نشتریت میرؔ کی یاد دلاتی ہے، تو ان کا ادراکِ رنگ و نور، حد سے بڑھا ہوا احساس جمال اور خارجیت اور داخلیت کا دلکش امتزاج مصحفیؔ اور حسرتؔ سے کسب فیض کی شہادت دیتا ہے، نیز ان کا طرز تفکر اور فلسفیانہ بصیرت غالبؔ سے ذہنی قربت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

1935-40ء کے قریب فراقؔ نے شعوری طور پر، تقلیدی اور روایتی رنگ سخن سے انحراف کرنا شروع کیا۔ شعور کی پختگی کے علاوہ، ہندی اور انگریزی ادب کے مطالعے نے ذہن کو وسعت بخشی۔ چنانچہ ان کے دور دوئم (1940ء کے بعد) کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ اور زندگی سے الجھنے اور اس کو سمجھنے کی شعوری کوشش، حیات و کائنات کے مسائل اور ان پر غور فکر، نیز ان سے ہم رشتگی کا احساس، عورت و مرد اور ان کے باہمی تعلقات، اور جنس وغیرہ جیسے موضوعات ان کے اشعار کے پیکر میں ڈھلنے لگے۔ موضوعات کے تنوع کے علاوہ ان کا انداز فکر بھی انہیں دیگر شعراء سے ممتاز کرتا ہے۔ دراصل فراقؔ کی شاعری کی فکری اساس خالص ہندوستانی، بلکہ ہندو فلسفے پر قائم ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں حیات و کائنات، انسان و خدا، حسن و عشق، زندگی اور موت وغیرہ کے تصورات خالص ویدک فلسفے پر مبنی ہیں۔ ان کی شاعری کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے۔ ان کی غزلوں کا یہ ہندوستانی پس منظر قلی قطب شاہ، نظیرؔ اکبر آبادی اور ولیؔ دکنی سے قدرے مختلف ہے، بلکہ فراقؔ کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر وہ ہے، جو کالی

داس، جائسی، سورداس، میرابائی، ودیاپتی اور جے دیو وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہی فراق کہ انفرادیت ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو خالص، قدیم ہندوستانی فضا کے پس منظر میں پیش کیا۔ یہ ہندوستانی فضا، اردو شاعری کی روایات اور غزل کے متعدد رنگوں سے مل جل کر، ان کی غزلوں میں قوس وقزح کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا واضح، منفرد اور بنیادی عنصر ہے۔ بطور مثال یہ اشعار دیکھیں، جن میں مذکورہ عنصر بہت ہی نمایاں ہے:

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو　　زندگی کیا ہے رام کا بن باس

شیو کا وِش پان تو سنا ہو گا　　میں بھی اے دوست پی گیا آنسو

فراق نے جس طرح قدیم ہندوستانی فلسفے اور ہندو مذہب سے استفادہ کیا اسی طرح انہوں نے قدیم ہندی اور سنسکرت شاعری کے تجربوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چند مثالیں دیکھیے: سنسکرت کا مشہور ڈرامہ نویس ''بھاس'' کہتا ہے کہ پچھلے پہر مندروں میں جلتے ہوئے چراغ ایسے لگ رہے ہیں جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ فراق کا تصرف ملاحظہ ہو:

دلوں میں داغ محبت کا یہ عالم ہے　　کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات کے چراغ

اسی طرح سنسکرت کا ایک شاعر کہتا ہے کہ میری پریہ (محبوبہ) جہاں جہاں قدم رکھتی ہے، وہاں کنول اُگ آتے ہیں۔ اب فراق کے یہ اشعار دیکھیے:

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے　　اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

فرش میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ　　دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی

اسی طرح ان کے متعدد اشعار میں، دیگر ہندی شاعروں بالخصوص میرابائی اور سورداس وغیرہ کے اثرات کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔

قدیم ہندوستانی فضا اور روایات سے کسب فیض کرنے کے علاوہ فراق نے مغربی ادب سے بھی، فکری اور فنی، دونوں سطحوں پر استفادہ کیا۔ وہ انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی پڑھنا اور پڑھانا نہ صرف ان کا پیشہ تھا بلکہ ان کا

اوڑھنا اور بچھونہ بھی تھا، وہ انگریزی شاعری کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جہاں انگریزی ادب سے بہترین منظوم ترجمے کیے وہیں مغربی ادب کے تجربات، احساسات اور روایات کو انہوں نے بہت قرینے سے اپنی غزلوں میں برتا۔ ان کے منظوم تراجم کے ماخذ کی نشاندہی تو بآسانی کی جاسکتی ہے، لیکن قدیم ہندوستانی اور مغربی ادب کے عناصر، روایات اور تجربات کو انہوں نے اس طرح اپنی شاعری میں سمویا ہے کہ ان کے ماخذ کی نشاندہی مشکل ہے۔ یوں بھی فراقؔ بذاتِ خود اس بات کے قائل تھے کہ شاعر یا ادیب جتنی کامیابی سے کسی دوسرے ادب کے تجربات کو برتے گا، اتنا ہی زیادہ یہ بتانا دشوار ہوگا کہ یہ تجربہ کس زبان و ادب سے کسب کیا گیا ہے حتیٰ کہ شاعر یا ادیب بذاتِ خود ان تجربات اور اثرات کی نشاندہی بذاتِ خود نہ کرے۔ بزعمِ خود، وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ انہوں نے دیگر زبان و ادب کے تجربات کو بڑی ہی خوبی، کامیابی اور سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔ انہوں نے دیگر ادب سے استفادہ کرنے کے باوجود اپنا مخصوص اور منفرد لب ولہجہ برقرار رکھا، بلکہ مغربی ادب کے تجربات اور احساست کو ہندوستانی مزاج عطا کر دیا۔ تاہم اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ انہوں نے ورڈس ورتھ، ٹینی سن، اور ولیم بلیک وغیر جیسے مغربی شاعروں کے خیالات و تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسا کہ نقی حسین جعفری فراقؔ کی شاعری کی اس صفت کا اعترف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں (فراقؔ) نے انگریزی نظموں کے اردو ترجمے کے دور کو بڑی فن کاری کے ساتھ ایک نئی شعری روایت میں تبدیل کر دیا۔ یہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہوتا ہے، لیکن فراقؔ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انگریزی شاعری کے بعض غالب اور اہم رجحانات اور رویوں کو بھی اردو میں روشناس کرایا۔ فراقؔ کا یہ تجربہ کتنا مفید اور کامیاب ہے، اس بات کا اندازہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ آج اردو شعر گوئی کی روایت میں انگریزی ہی نہیں بلکہ بہت سی غیر ملکی زبانوں کے اہم اور مقبول رجحانات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔''

مختصراً اردو شاعری کو فراقؔ کی ایک بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو قدیم ہندوستانی روایات، زبان و

ادب سے قریب تر کر دیا اور مغربی ادب کے تجربات اور روایات کو غزل کی فضا میں شامل کر دیا۔

فراقؔ کی غزلوں کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے، جو خالص مادی اور دنیاوی ہے۔ چونکہ فراقؔ جسم کی مادیت کے پرستار ہیں اس لیے ان کے یہاں جسم کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ فراقؔ جنس ہی کے راستے سے عشق کی تلاش کرتے ہیں لیکن اس کے معنی، ہرگز یہ نہیں ہیں کہ جنس ان کے یہاں عریاں ہو کر سامنے آتی ہے بلکہ جنسی جذبہ بھی جمالیاتی کیفیت میں تبدیل ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہ جنسی اور جذباتی گھٹن محسوس نہیں ہوتی جو لکھنؤ اسکول کا خاصہ ہے۔ دراصل فراقؔ قدیم ہندو تصور کے مطابق، جنس کو تطہیر جذبات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ عشق ان کے نزدیک صرف جسمانی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ وجدانی انبساط اور تقدیس کا سرچشمہ بھی ہے۔ فراق کے الفاظ ہیں:

> ''پر عظمت عشقیہ شاعری کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ ایسی شاعری ایک تو ہمارے ادراک و جذبات میں بڑی قوتیں اور لطافتیں پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے ایسی شاعری جنم اس وقت لیتی ہے جب عشق کی شدتیں صحیح سلامت رہ جائیں لیکن اس کی کثافتیں اور آلودگیاں شعور میں اپنی ارتقائی صورت حاصل کر لیں۔ اس وقت محبت کا طوفان بھرپور ہوتا ہے لیکن اس میں ایک سکون بھی آ جاتا ہے۔''

فراقؔ کے مذکورہ بالا بیان کے آئینے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی ہے

میری آغوش سے اٹھ کر کبھی آئینہ دیکھا ہے سحر کو اور بڑھ جاتی ہے دوشیزگی تیری

درج بالا اشعار اردو شاعری کی روایت سے قطعی مختلف ہیں۔ ان کے مبتذل ہونے یا نہ ہونے کی بحث اور فراقؔ کے مذکورہ خیال سے اتفاق یا عدم اتفاق سے قطع نظر یہ بات حتمی ہے کہ جہاں کہیں فراقؔ نے اپنے جذبات کو تہذیب اور اور شائستگی کے ساتھ پیش کیا ہے وہاں ان کی شاعری میں سرشاری اور والہانہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرز کے اشعار میں کہیں کہیں بے پناہ سوز و گداز اور دردمندی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ شاید یہ غم انگیز تاثر ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی دین ہے:

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

پھر یہ کیسی کسک سی ہے دل میں
تجھ کو مدت ہوئی کہ بھول چکا

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی! ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

فراقؔ کا تصور عشق محدود نہیں۔ وہ اپنے اردگرد عشق ومحبت کا حصار کھینچ کر آنکھیں نہیں چراتے۔ عشق کو محبوب کے جلوہ گاہ تک محدود رکھنے کے بجائے اس میں ساری کائنات کو شامل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے انسانوں کی زندگیوں میں پائی جانی والی محرومیوں اور ناکامیوں کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی غزلوں میں ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ عرفان عشق کے ساتھ ساتھ، نئی قدروں اور زندگی کے سینے میں پلنے والے طوفانوں کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر غم جاناں اور غم دوراں دونوں ایک دوسرے میں گھل کر فراقؔ کی غزلوں کی شعری فضا کو ایک عجیب سا تاثر دے جاتے ہیں:

اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہوگئی ہے
چپ ہوگئے ترے رونے والے   دنیا کا خیال آ گیا
زندگی کیا ہے آج اے دوست   سوچ لیں اور اداس ہوجائیں
اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں   ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن کی ایک رات

فراقؔ کی شاعرانہ شخصیت کو عظمت بخشنے میں ان کے لب و لہجے کا بھی بڑا دخل ہے۔ جس میں بلا کا سوز اور

ساتھ ساتھ بلا کی رعنائی اور دلکشی بھی ہے۔ اس معاملے میں بھی انہوں نے پرانی روایت سے استفادہ ضرور کیا لیکن اس میں بھی اپنی ذہانت سے اضافہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنے ہمہ گیر تجربوں کو نئے لب و لہجے اور نئے آہنگ کے ساتھ پیش کر کے کائنات غزل کو وسعت بخشی۔ فراقؔ نے اپنے فن کو بیرونی عناصر کے بجائے ہندوستان کی دھرتی پر بکھرے ہوئے حسن پاروں سے اس طرح سجانے کی کوشش کی کہ ان کا لہجہ نہ صرف ممتاز اور منفرد نظر آتا بلکہ اس میں بڑی اپیل بھی پیدا ہوگئی ہے۔ فراق نے غزل کی مروجہ تشبیہوں اور استعاروں میں ہندوستانیت کی روح کو شامل کر دیا ہے جس کی بدولت ان کے اشعار میں ہندی شاعری میں پائی جانے والی ارضیت، نغمگی، موسیقیت، تازگی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے:

خیال گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ

جیسے پھیلتا جاتا ہے شام کا سایہ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی

کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو

زندگی کیا ہے رام کا بن باس

فراقؔ کی تشبیہوں اور استعاروں میں ندرت اور دلکشی کے ساتھ ساتھ حرکت اور زندگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ حرکت اور زندگی شاید ان مظاہر فطرت کی وجہ سے ہے جن سے انہوں نے اپنی تشبیہوں اور استعاروں کو سجایا ہے۔ شام صبح، ستارے، پھول، اور شبنم وغیرہ ان کی شاعری میں شامل ہو کر مختلف حقیقتوں کی زندہ علامتیں بن جاتی ہیں۔ یہ علائم چوں کہ ہمارے گرد و پیش سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے دلکش اور موثر محسوس ہوتے ہیں۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں

ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

فراق کی متعدد شعری خوبیوں کے باوجود ان کی بسیار گوئی ان کی غزلوں کی ایک بڑی خامی ہے۔ ان کی غزلوں میں بسا اوقات اشعار کی تعداد پچیس تیس تک پہنچ جاتی ہے۔ غالباً اس سبب سے ان کی طویل غزلوں میں بہتیرے اشعار صرف قافیہ پیمائی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور طوالت کے علاوہ تکرار مضمون کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دوسرا بڑا عیب ان کی شاعری کا یہ ہے کہ انہوں نے جہاں ہندی اور اردو زبان کی آمیزش سے شاعری کے خوبصورت نمونے پیش کیے وہیں بعض جگہوں پر ان کی زبان کھردی اور اکھڑی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً درج ذیل اشعار میں لفظوں کا انتخاب دیکھیے۔ غزل جیسی صنف ایسی زبان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

دل کو دیکھ لے دل میں بنا لے

پریم باٹکا پریم تڑاگ

کر کے دکھا کچھ لے کے نہ بیٹھ

خوشی اور غم کا کھڑاگ

ان خامیوں کے باوجود، بطور مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ فراق ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کے وسیع تر امکانات پر غور کیا اور اسے نئی سمتوں سے آشنا کیا۔ انہوں نے ہر تحریک کے صحت مند عناصر کو سمجھا اور اپنی غزلوں میں جگہ دی نیز غزل کو نیا انداز فکر اور نئی زبان عطا کی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. فراق شاعری میں کس کے شاگرد تھے؟

11. فراق کے چند ایسے اشعار لکھیے جو قدیم ہندوستانی ادب اور ہندی زبان سے متاثر ہوں۔

12. فراق کی شاعری کا دوسرا دور کب شروع ہوا؟

13. فراق کی غزلوں کی چند واضح خوبیاں لکھیے۔

5.6 فراقؔ کی غزل (1)

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے، اے دوست!
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہیں ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب، یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

5.6.1 مجموعی تاثر

وہم اور یقین کے درمیان کی کیفیت اس غزل کا خاصہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس غزل کے جملہ اشعار پر ایک طرح کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ اس دھند کی کیفیت کے سبب اشعار کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ واضح رہے کہ دھند یا ''نیم حجابی'' فنون لطیفہ کے لطف کو فزوں تر کرنے والے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ کیونکہ بے پردہ حسن کے مقابلے میں نیم پردہ حسن اور واضح تصاویر و خیالات کے مقابلے میں غیر واضح تصاویر و خیالات انسانی ذہن، فکر، خیالات اور تصورات کو انگیخت کرتے ہیں۔ کسی کہانی کا ایک نہایت ہی معنی خیز جملہ ہے کہ روشنی کے گل ہونے سے بینائی کا راستہ رک جاتا ہے، پھر تصور چل پڑتا ہے۔ اس جملے کو ذہن میں رکھ کر غزل کو محسوس کریں، واقعی لطف اندوز ہوں گے۔

5.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: محبت سے کنارہ کشی کی وجہ سے اب نہ تو میرے سر میں سودائے محبت ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی تمنا اور آرزو ہے، یعنی محبت سے دوری نے میرے دل کو پژمردہ کر دیا ہے، دل کی ساری امنگوں کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن ترک محبت کا یہ بھرم اور عزم کب تک قائم رہے گا؟ مجھے اس کے تا دیر قائم رہنے پر بھروسہ نہیں ہے۔

دوسرا شعر: محفل محبوب میں میرے دل کا یعنی میرا شمار نہ تو بے گانوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی واقف کاروں میں، گویا میں محبوب کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود میرا دل جلوہ گاہ ناز یعنی محبوب کی محفل سے اٹھنے کو تیار نہیں ہے۔

تیسرا شعر: اے دوست! ترس کھا کر مہربانی کرنے کو محبت میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ میں تو تمہارے اس ترحم کے بجائے تمہاری اس بے جا خفگی اور رنجش کا خواہشمند ہوں جو تو مجھ سے محبت کے طور پر روا رکھتا تھا۔

چوتھا شعر: بہت دنوں سے ہم کو تمہاری یاد نہیں آئی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے تم کو فراموش کر دیا ہے۔ بس غم دوراں اور دنیاوی مصروفیتوں کی وجہ سے تمہاری یادوں میں گم نہیں ہو سکا۔ تقریباً اسی موضوع پر غالبؔ کا شعر ہے:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

پانچواں شعر: آہ! (افسوس کرتے ہوئے) دوستوں کا یہ مجمع اور ان کی خاموش محفل۔ افسوس کہ آج اس محفل احباب میں فراقؔ بھی اپنا کلام نہیں سنا رہے ہیں۔ وہ فراقؔ جو محبوب کی موجودگی میں ہمیشہ چہکتا رہتا تھا آج اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ بھی خاموش ہے۔ مختصراً محفل میں آج محبوب کی عدم موجودگی کی وجہ سے خاموشی طاری ہے۔

5.7 فراقؔ کی غزل (2)

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی! ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی، وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بہ عنوانِ دگر وہ مان لیتے ہیں
فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں، کبھی پہچان لیتے ہیں

5.7.1 مجموعی تاثر

غزل کا ہر شعر، باعتبار موضوع ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس غزل میں بھی تقریباً تمام شعر کے موضوعات منفرد ہیں تاہم ''یاد'' اور ''محبت'' اس مکمل غزل کا بنیادی تاثر ہے۔ ''یاد کی چادر'' جو ہندی شاعری کے تصور ''اب کے برس مری رنگ دے چنریا'' اور ''باتوں کے مان لینے کا عمل'' سے واضح ہوتا ہے کہ اس غزل میں روح اور جوہر کے مقابلے میں ''مادہ'' کو فوقیت حاصل ہے۔

5.7.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: اے محبوب! ہم محض تمہارے قدموں کی آہٹ سے تم کو جان لیتے ہیں، تمہارے وجود کا احساس کر لیتے ہیں۔ اے وہ محبوب جو ہماری زندگی ہے، تمہیں تو ہم دور ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ یعنی محبت میں اس قدر شدت ہے کہ حواس خمسہ کے بغیر ہی ہم اس کا ادراک کر لیتے ہیں۔

دوسرا شعر: جسے دنیا کامیابی کہتی ہے اس کو پانے کے لیے طرح طرح کی قیمتیں چکانی پڑتی ہیں۔ ہم کو تو کامیابی کے لیے طرح طرح کی قیمتیں چکانے والے لوگوں کی نادانی پر افسوس ہوتا ہے۔

تیسرا شعر: جب سنسان اور خاموش راتوں میں اپنی طبیعت گھبراتی ہے، تو ہم اپنے محبوب کو یاد کر لیتے ہیں۔ گویا اس کی یاد مفرح اور طبیعت کو سکون دینے والی ہے۔ واضح رہے کہ ''یادوں کی چادر'' کا مفہوم محض ''یاد'' تک محدود نہیں ہے بلکہ ایسی یاد جو جسم سے روح تک اور سر سے پیر تک ہر عضو، ہر شئے کو اپنے حصار میں لے لے۔ یعنی ایسی یاد جس میں ہر بن مو مصروف عمل ہو جائے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''تری یاد'' میں ''تری'' کا مرجع جہاں محبوب ہے وہیں ذات باری بھی اس کا مقصود ہو سکتا ہے۔

چوتھا شعر: دوستی اور محبت میں ان بن اور اختلافات کی مٹھاس شامل ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تھوڑے بہت اختلافات دوستی اور محبت کو مزید پختہ کر دیتے ہیں۔ اس لیے وہ یعنی محبوب مری باتوں کو کسی نہ کسی طریقے سے مان لیتا ہے۔ یعنی ہمارے مابین ایسی ہم آہنگی جس میں اختلافوں کی گنجائش ہی نہیں لیکن وہ میری مخالفت صرف اس لیے کرتا ہے کہ کچھ دیر اختلافات کا لطف اٹھایا جائے اور تاکہ تھوڑی بہت ان بن سے محبت میں مزید شدت اور گہرائی پیدا ہو جائے۔

پانچواں شعر: اے فراقؔ! بھیس بدل کر اکثر ہم سے کوئی کافر (یعنی محبوب) ملتا ہے۔ کبھی تو ہم بھیس بدلنے کے باوجود اس کو پہچان لیتے ہیں تو کبھی اس کے ناز و انداز سے ہم جان لیتے ہیں کہ یہ سوائے میرے محبوب کے کوئی اور نہیں۔

5.8 خلاصہ

فراقؔ گورکھپوری کا پورا نام رگھوپت سہائے اور تخلص فراقؔ گورکھپوری تھا۔ اپنے گھر کے شاعرانہ ماحول میں انہوں نے ہوش سنبھالا اور اوائل عمر سے ہی شاعری کی ابتداء کی۔ بی اے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لیے منتخب ہوئے لیکن استعفیٰ دے کر آزادی کے متوالوں میں شامل ہو گئے۔ ایم اے کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت انگریزی استاد تقرر ہو گیا، لیکن انہوں نے اپنا سارا تخلیقی کام اردو میں ہی کیا۔ انہوں نے اردو شاعری میں قدیم ہندوستانی شاعرانہ تصورات اور مغربی ادب کے خیالات اور تجربات کو شامل کر کے اردو ادب کو وسعت دی۔ انہوں نے بہترین غزلوں کے علاوہ کئی کامیاب نظمیں اور رباعیاں بھی لکھیں۔ ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں

گیان پیٹھ انعام سے نوازا گیا اور یو جی سی نے انہیں اپنا فیلو مقرر کیا۔ دل کا دورہ پڑنے کے سبب 3 مارچ 1982ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **10-10** سطروں میں دیجیے:

1. فراقؔ کی مختصر سوانح رقم کیجیے۔
2. فراقؔ کی ادبی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب **30-30** سطروں میں دیجیے:

1. فراقؔ کی حیات کا احاطہ کرتے ہوئے اُن کی غزل گوئی کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کیجیے۔
2. اپنی پسند کے فراقؔ کے چند اشعار لکھیے۔ اُن کی تشریح کرتے ہوئے اپنی پسندیدگی کا سبب بتائیے۔
3. درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہیں ہمیں   اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں   ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

5.10 فرہنگ

شغف	دلچسپی
ایما	مرضی
آزاد تلازمہ	ادب کی ایک تکنیک ہے
وسعت	پھیلاؤ
تحلیل نفسی	نفسیات کی ایک اصطلاح ہے

تقدیس	بزرگی
گج گامنی	ہاتھی جیسی چال
آفاقی	عالمی
دیوناگری	ہندی رسم الخط
ہرلینا	پکڑلینا، گرفتار کرلینا، جیت لینا
گیان پیٹھ ایوارڈ	حکومت ہند کی جانب سے دیا جانے والا سب سے بڑا ادبی انعام
برگ وبار لانا	پھول پتے لانا، ترقی کرنا
طرزِ فکر	سوچنے کا طریقہ
کسب فیض کرنا	فائدہ اٹھانا
امتزاج	اختلاط، باہم ملنا
وِش پان	زہر کا پینا
استفادہ کرنا	فائدہ اٹھانا
تطہیر	پاک کرنا
کثافت	غلاظت
آلودگی	گندگی
غم دوراں	زمانے کا غم
غم جاناں	محبوب کا غم
یگانہ	واقف کار
رنجش	دشمنی، ناراضگی

بے جا	بلاوجہ
چاشنی	مٹھاس
اختلاف	ان بن، خلاف

5.11 معاون کتابیں

1. فراقؔ کی شاعری — ڈاکٹر افغان اللہ خان
2. اردو غزل — ڈاکٹر کامل قریشی

5.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. فراقؔ گورکھپوری کا پورا نام رگھوپت سہائے اور تخلص فراقؔ تھا۔
2. فراقؔ گورکھپور میں پیدا ہوئے۔
3. فراقؔ ڈپٹی کلکٹری کی سرکاری نوکری کے لیے نامزد ہوئے تھے۔
4. فراقؔ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے استاد تھے۔
5. ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: مشعل، شعلہ ساز، گل نغمہ، دھرتی کی کروٹ اور چراغاں۔
6. فراقؔ کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے 1970ء میں نوازا گیا۔
7. ہندو گھرانوں کی عورتیں اور ہندو تہذیب فراقؔ کی رباعیوں کا خاص موضوع ہے۔
8. فراقؔ کی چند نظموں کے نام ہیں: ہنڈولا، آدھی رات، جگنو اور پرچھائیاں وغیرہ۔
9. 1970ء میں ساہتیہ اکادمی نے فراقؔ کو اپنا فیلو مقرر کیا۔
10. فراقؔ وسیمؔ کے شاگرد تھے۔

خیال گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ — جیسے پھیلتا جاتا ہے شام کا سایہ

11. دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی   کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ
ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو   زندگی کیا ہے رام کا بن باس

12. فراؔق کی شاعری کا دوسرا دور 1940ء کے آس پاس شروع ہوا۔

13. فراؔق کی غزلوں کی واضح خصوصیات ہیں: ہندی اور اردو زبان کی آمیزش والی زبان، قدیم ہندوستانی ادب وروایات کا غزلوں میں استعمال، انگریزی ادب سے استفادہ اور مقامی رنگ میں رنگی ہوئیں تشبیہیں اور استعارات وغیرہ۔

اکائی 6 : ناصؔر کاظمی

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 ناصؔر کاظمی: حیات

6.4 ناصؔر کاظمی کی غزل گوئی

6.5 ناصؔر کاظمی کی غزل (1)

6.5.1 مجموعی تاثر 6.5.2 غزل کی تشریح

6.6 ناصؔر کاظمی کی غزل (2)

6.6.1 مجموعی تاثر 6.6.2 غزل کی تشریح

6.7 خلاصہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 معاون کتابیں

6.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

6.1 اغراض ومقاصد

ناصؔر کاظمی نئی اردو غزل کے ایک ممتاز اور معتبر شاعر تھے۔انہوں نے اردو غزل کو نئی جہات سے آشنا کیا۔ان کی شاعری میؔر کی تقلید ہے۔ غالؔب، اقباؔل اور فراؔق کے اثرات بھی ان کے کلام میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ہندو پاک میں نئی شاعری کو جن چند ناموں نے آبروبخشی ان میں ناصؔر کاظمی سرفہرست ہیں۔انہوں نے سادگی اور سچائی کو

ہمیشہ ترجیح دی۔ان کی شاعرانہ خصوصیات کی غرض وغایت سے آپ کوواقف کرانے کے لئے یہ اکائی نصاب میں شامل ہے۔آپ یقیناً ناصؔر کاظمی کی شاعری کو اپنی زندگی کی شاعری محسوس کریں گے۔

6.2 تمہید

اس اکائی میں ناصؔر کاظمی کی حیات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا جائے گا تا کہ آپ ان کی شعری بصیرت سے آگہی حاصل کرسکیں۔ یہاں آپ کے مطالعہ کے لیے ان کی دو اہم غزلیں بھی ہوں گی۔ان غزلوں کے تمام اشعار کی تشریح سادہ اور عام فہم زبان میں کی جائے گی اور ان پر مجموعی تاثر کا اظہار بھی کیا جائے گا،اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔اس اکائی کے مطالعہ سے آپ کو ناصؔر کاظمی کی زندگی اور شاعری سے متعلق معلومات حاصل ہوسکیں گی۔

6.3 ناصؔر کاظمی:حیات

ناصؔر کاظمی کا اصل نام سید ناصر رضا اور قلمی نام ناصؔر کاظمی تھا۔ان کی پیدائش 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں اپنے نانا کے مکان 'کنیز منزل'،محلّہ قاضی واڑہ میں ہوئی۔ان کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے ہوتا ہوا حضرت علی بن ابی طالب سے جا ملتا ہے۔ان کے دادا کا نام سید شریف الحسن تھا جو ایک وضع دار انسان کے ساتھ زمین دار بھی تھے۔ان کی زمینداری نصیر پور،مگر پورہ اور راج گڑھ تک پھیلی ہوئی تھی۔وہ پولس انسپکٹر بھی تھے۔انہوں نے اپنی یہ ملازمت بڑے خلوص اور ذمہ داری کے ساتھ کی۔وہ جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بڑی تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ غرض کہ ان کی زندگی خلوص ووفا،ایثار وقربانی اور انسان دوستی سے عبارت ہے۔

ناصؔر کاظمی کے والد سید محمد سلطان بھی ایک متقی،پرہیز گار،غریب پرور اور زندہ دل انسان تھے۔وہ صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز رہے۔والد کے انتقال کے بعد ناصؔر کاظمی اور ان کے اہل خانہ کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔کبھی کبھی ایسا بھی وقت آیا کہ گھر کے چولہے میں آگ جلنا بھی مشکل ہوگیا۔تنگ دستی سے حالات اتنے بگڑ گئے کہ

ناصؔر کاظمی نے اپنی والدہ کے زیورات کو فروخت کر کے ضروری کام کیئے اور اپنی زندگی اور گھر والوں کی گاڑی کو پٹری پر لانے کی کوشش کی۔ دراصل ان کے لئے یہ دور پر آشوب ثابت ہوا۔ پریشانیاں کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں لیکن ناصؔر کاظمی نے صبر وضبط کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور ہمت اور حوصلہ سے کام لیا۔ جوانی کے دنوں میں ناصؔر کاظمی کی زندگی کے اندر جو لاابالی پن تھا وہ ماں کی رحلت اور شادی کے بعد کم ہو گیا یعنی انہوں نے اپنی زندگی کی ڈور کو جہد پیہم سے باندھے رکھا۔

ناصؔر کاظمی ہمیشہ اسکول جانے سے جی چراتے رہے کیونکہ انہیں اسکول کا طریقۂ تعلیم قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ درسی نظام تعلیم میں تبدیلی چاہتے تھے لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ پڑھائی سے دور بھاگنے کے باوجود جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آتا تو وہ اکثر اوّل آتے۔ ناصؔر کاظمی جب بی اے کے طالب علم تھے تو ملک کی تقسیم کا سانحہ پیش آیا اور ان کا خاندان انبالہ (ہندوستان) سے ہجرت کر کے لاہور (پاکستان) چلا گیا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے ان کی بی اے کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ناصؔر کاظمی کا خاندان ہجرت کا کرب، خون ریز تصادم اور لوٹ مار کے بازار کا صدمہ جھیل چکا تھا۔ ملک کی تقسیم اور اس کے اثرات ناصؔر کاظمی پر بھی مرتب ہوئے۔ انہیں اپنا شہر انبالہ چھوڑنے کا بے حد رنج تھا۔

ناصؔر کاظمی کو بہت سی چیزوں کا شوق تھا۔ وہ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ اور قلعہ اکبر کی سیر گاہوں میں طوطے پکڑنے اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر جایا کرتے تھے۔ انہیں بچپن سے ہی کبوتر پالنے، کبوتروں سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے اور گھڑ سواری کا بھی بے حد شوق تھا۔ کبوتر پالنے کا یہ شوق تو زندگی کے آخری ایام تک برقرار رہا۔ انہیں مصوری اور موسیقی بھی بے حد پسند تھی۔ نفسیات اور فلسفہ کے مطالعے سے بھی ان کی گہری دلچسپی تھی۔

ناصر کاظمی پائلٹ بننا چاہتے تھے مگر صورتحال کے سبب اُنہیں ریڈیو کی ملازمت قبول کرنی پڑی۔ پھر 'اوراقِ نو'، 'ہمایوں' اور 'خیال' جیسے معیاری رسالوں کے ادارتی فرائض احسن طریقے سے انجام دینے لگے۔ ایک مدیر کی حیثیت سے انہوں نے رسالہ 'اوراقِ نو' کا کام 1950ء سے 1951ء تک اور 'ہمایوں' کا کام 1952ء سے 1957ء تک کیا۔ جبکہ مدیر اور ناشر کے طور پر 'خیال' کی ادارت 1957ء میں کی۔ وہ 'ہم لوگ' کے نائب مدیر بھی رہے۔ ان کی ملازمت کا

یہ سلسلہ ختم ہوا تو انہوں نے 'ولیج ایڈ' میں نوکری کر لی جہاں یکم جنوری 1959ء سے 31 جولائی 1969ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ بعدازیں محکمہ ایگری کلچرل انفارمیشن میں ٹریننگ اسپشلسٹ کی حیثیت سے دو برسوں تک اپنے فرائض انجام دیے۔ لیکن 22 جون 1964ء کو انہوں نے اپنی اس ذمّہ داری سے استعفیٰ دے دیا اور یکم اگست 1964ء کو ریڈیو پاکستان (لاہور) سے وابستہ ہوگئے اور یہاں انہوں نے اسٹاف آرٹسٹ کی حیثیت سے تادم آخر اپنی ملازمت کو سلیقے سے نبھایا۔

ناؔصر کاظمی کی شادی سید انور الحق صاحب کی بیٹی شفیقہ بانو سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹوں کے نام باصر رضا اور حسن رضا ہیں۔ ان کے عزیز دوستوں میں انتظار حسین، احمد مشتاق، حفیظ ہوشیار پوری، غالب احمد، سجاد باقر رضوی، سعید احمد، شیخ سعید اختر، مظفر علی سید، اختر محمود، حنیف رامے، شیخ صلاح الدین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ انہیں دوستوں کے ساتھ ان کا بہتر وقت گزرتا تھا اور بزم دوستاں کا چراغ روشن تھا۔ ناؔصر کاظمی بنیادی طور پر ایک مذہبی اور نمازی آدمی تھے۔ رمضان المبارک میں وہ تمام روزے رکھتے اور تلاوتِ کلام پاک کی بھی پابندی کرتے تھے۔

ناؔصر کاظمی کے پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں غزلوں پر مشتمل مجموعے 'برگِ نے' (1952ء)، 'دیوان' (1972ء)، 'پہلی بارش' (1975ء)، اور نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ 'نشاط خواب' (1977ء) اور ایک طویل منظوم ڈراما 'سر کی چھایا' (1981)ء شامل ہیں۔ ان کی نثری کتابوں میں 'خشک چشمے کے کنارے' (1982ء)، 'انتخاب میر' (1989ء)، 'انتخاب نظیر' (1990ء)، 'انتخاب ولی' (1991ء)، 'انتخاب انشاء' (1991ء) اور 'ناؔصر کاظمی کی ڈائری' (1995ء) قابل ذکر ہیں۔ اب ان کا کلیات 'کلیات ناؔصر' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے جس میں 'برگِ نے'، 'دیوان' اور 'پہلی بارش' کی تمام غزلیں اور 'نشاط خواب' کی تمام نظمیں نیز 'سر کی چھایا' کا طویل منظوم ڈراما شامل ہے۔ 'کلیات ناؔصر' میں 12 غیر مطبوعہ غزلیں اور 32 متفرق اشعار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ 'کلیات ناؔصر' میں جو غیر مطبوعہ غزلیں اور اشعار موجود ہیں وہ یوں تو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن یہ کلام ان کے کسی بھی شعری مجموعہ میں شامل نہیں تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. ناصرؔ کاظمی کا اصل نام کیا ہے؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

2. ناصرؔ کاظمی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

3. ناصرؔ کاظمی کن کن رسالوں سے وابستہ رہے؟

6.4 ناصرؔ کاظمی کی غزل گوئی

ناصرؔ کاظمی نے غزل کے کلاسیکی آداب وآئین میں خود کو قید رکھا لیکن اسی کے ساتھ غزل کی ایک نئی فضا بھی تیار کی جس میں اداسی، تنہائی، رات، صحرا، شہر، اجنبیت، بے دلی وغیرہ کے شخصی جذبات کی آنچ کی لو تیز نظر آتی ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے اپنی غزلوں میں ہندوستان کی تقسیم کا المیہ، ہجرت کا کرب، فرقہ وارانہ فسادات اور معاصر عہد کی بے چہرگی کے احساس کو اپنے منفرد اسلوب کے سانچے میں ڈھال کر ایک نئی شعری بستی آباد کی ہے۔ ان کے پہلے شاعری مجموعہ کلام 'برگِ نے' میں ایسے بے شمار اشعار مل جاتے ہیں جن سے گہرے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے، لیکن اتنے نازک اور کرب ناک تجربات سے گزرنے کے بعد بھی ناصرؔ کاظمی کا لہجہ چیخ وپکار سے کوسوں دور ہے۔

ہندوستان کو آزادی تو ضرور ملی لیکن تقسیم کے سائے اور ہجرت کے درد نے ہند وپاک دونوں طرف کے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ لاکھوں ہندوستانی اپنی تہذیبی اقدار اور ادبی خزانے کو لے کر نئے ملک میں آباد ہوئے لیکن اپنی مٹی کی خوشبو کو ہمیشہ محسوس کیا یعنی پاکستان میں رہ کر بھی ہندوستان کو دل میں بسائے رکھا۔ اسی طرح کا ردعمل دوسری طرف بھی ہوا۔ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ پنجاب میں زبردست فسادات ہوئے جس سے لوگوں نے پاکستان کے لیے اپنا رختِ سفر باندھا۔ ناصرؔ کاظمی اور ان کا خاندان بھی فسادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ناصرؔ اور ان کے گھر والوں نے فسادات کی بدولت انبالہ سے ہجرت تو کی مگر ورثے کے طور پر خون خرابے، حادثے، قتل وغارت گری اور صدمات ہی ان کے حصے میں آئے۔ پاکستان کی اولین غزلیہ شاعری میں انہیں

فسادات، اقدار کی شکست وریخت، ہجرت اور ماضی کے آنگن میں تنہائی کی صدا خوب سنائی دیتی ہے۔ ناصؔر کاظمی نے بھی اپنے پاکستان کے ہم عصر شعراء احمد فرازؔ، شہزاد احمد، احسان دانش وغیرہ کی طرح اس عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور پھر اسے شعری پیکر عطا کیا، نیز آزادی کو فریب آزادی سے تعبیر کیا۔ اس تعلق سے چند اشعار دیکھئے۔

کس قدر تاریکیوں میں آ گئے   ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے   میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ کے بعد یعنی 1958ء کے آس پاس ایک اہم رجحان ابھر کر سامنے آیا جو دراصل جدیدیت کی اساس تھی۔ فوجی حکومت کے ظلم وجبر سے وہاں کے عوام متنفر ہو گئے، گویا پوری زندگی سکتے میں آ گئی۔ اس عہد میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کی غزل گوئی میں رمزیت اور تہہ داری بڑھ گئی۔ غزل کے رموز وعلائم اور لفظیات میں تنوع پیدا ہوتا گیا جس سے شاعری ایک نئے اسلوب کے قالب میں ڈھل کر نمودار ہوئی، ساتھ ہی دونوں ملکوں کے عوام کی بے چینی، حالات کی کربناکی اور ہجرت سے پیدا ہونے والی بے گھری اور دربدری کے موضوعات کو اردو غزل میں کثرت سے استعمال کیا گیا۔ جس میں منفی اور مثبت دونوں رویے دیکھے گئے۔ درحقیقت یہی دور میرؔ کے اتباع کا بھی تھا۔ پاکستان میں شاعروں کے ایک گروپ نے میرؔ کی شعری کائنات سے استفادہ کیا جس کے سپہ سالار ناصؔر کاظمی کہلائے۔ انہوں نے میرؔ کے زمانے کی رات کو اپنے زمانے کی رات سے منسوب کر کے غزل کو ایک نئی معنویت بخشی، بلکہ انہوں نے 'رات' کو ایک نئے استعارہ کے طور پر استعمال کیا اور میرؔ کی از سرِ نو دریافت کی۔ دوسری طرف وہ میرؔ کی تقلید سے تنقید کے نشانہ بھی بنے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس سے ناصؔر کاظمی کی شاعری پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ بزرگ شاعروں کی زمینوں میں غزلیں کہنے کا رواج بہت پہلے سے ہماری اردو شاعری میں رہا ہے۔ آئیے یہاں میرؔ کی تقلید میں ناصؔر کاظمی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

تری گلی میں گیا، پھر گیا نہ پھر بولا
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا
(میرؔ)

وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
(ناصرؔ کاظمی)

افسردگی سوختہ، جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ
(میرؔ)

کرم اے صرصرِ آلامِ دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے
(ناصرؔ کاظمی)

'عشق' غزل کا ہمیشہ کلیدی موضوع رہا ہے اور ہر دور میں شاعروں نے عشق اور محبت کی مختلف کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ناصرؔ کاظمی کی غزل بھی عشقیہ جذبات سے معمور ہے جو سادگی اور سچائی سے عبارت ہے۔ دراصل ان کی غزل میں عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ عشق کی تمام کیفیات ذہن و دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ ان کا عشقیہ رویہ منفرد اور یگانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے منفرد عشقیہ لہجہ نے ان کو بڑا شاعر بنا دیا۔ عشقیہ موضوع کی رنگارنگی سے ان کی غزل دھیان کی سیڑھیوں پر اس طرح قدم رکھتی ہے کہ محبوب کو بھول سکنے اور کڑی دھوپ کے سفر میں سر پر خیالِ یار کی چادر لے کر چلنے کی بات کرتا ہے تو عشق کی کیفیات سے ذہن منور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح 'شبِ ہجر' میں کسی کی یاد نہ آنے کا ذکر کر کے ناصرؔ کاظمی نے عشقیہ غزل کو ایک نئی شعری بوطیقا سے ہمکنار کیا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

فکر یہ تھی کہ شبِ ہجر کٹے گی کیوں کر لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

حقیقت یہ ہے کہ ناصؔر کاظمی اپنے عشق کے اظہار میں دوسری چیزوں سے ضرور آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن ان کی عشقیہ شاعری میں ایک ایسی جمالیاتی حس موجود ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ان کا عشقیہ رویہ اپنی تہذیبی شناخت کا مظہر ہے یعنی اس میں مخصوص سماجی یا تہذیبی وثقافتی قدریں، موجزن نظر آتی ہیں۔

ناصؔر کی شاعری میں اجتماعی زندگی کی تلاش کی شعوری کوشش کم ملتی ہے لیکن عصری حالات سے ان کی شاعری یکسر خالی بھی نہیں ہے۔اس تعلق سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ناصؔر کاظمی کی زندگی کو ان کے گہرے تجربات نے کافی متاثر کیا۔وہ اپنے عہد کے حالات و واقعات سے دوچار ہوئے لیکن انہوں نے کبھی دباؤ محسوس نہیں کیا۔وہ اپنے دوسرے معاصرین کی طرح ان واقعات وحالات سے تخلیقی قوت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور بلندی آہنگی سے بچتے رہے۔وہ عصری تقاضوں سے واقف تھے لیکن ان تقاضوں کا رنگ کبھی اپنے کلام میں گہرا نہیں ہونے دیا۔انہوں نے اپنی شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور حالات حاضرہ کا براہ راست بیان کر کے شاعری کو شہر آشوب ہونے سے بچا لیا،لیکن بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہا جانا درست نہیں کہ ان کے یہاں 'روح عصر' ہے ہی نہیں۔کوئی فن کار کبھی 'روح عصر' سے خود کو نہیں محفوظ کر سکتا۔شاعری زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا نام ہے تو پھر 'روح عصر' سے خالی کیوں کر ہو سکتی ہے اور شاعر بھلا پوری انسانیت کے بارے میں کیوں نہیں سوچ سکتا۔

اب آیئے ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں سماجی انتشار اور دہشت خیزی کے شعری پیکر کو محسوس کریں تا کہ شاعر کے منفرد انداز بیان سے آگہی حاصل ہو سکے اور یہ بھی محسوس کریں کہ ناصؔر کاظمی نے عصری حالات کو اپنی تخلیقی قوت سے کس طرح ہم آمیز رکھا ہے۔چند اشعار بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں ۔

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

بازار بند، راستے سنسان، بے چراغ وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

شہر سنسان ہے کدھر جائیں خاک ہو کر کہیں بکھر جائیں

ناصؔر کاظمی کے یہاں لفظ شہر کا استعمال علامت کے طور پر خوب ہوا ہے۔ جدید شاعری میں شہر کی علامت کا کینوس کافی پھیلا ہوا ہے۔ ناصؔر کاظمی اپنے شعر میں شہر سے نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ ان سے ان کی فکر کی تہہ داری اور فن کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور شعر کے داخلی وخارجی انسلاک سے ایک نئی شعریت ابھرتی ہے۔ شاعر کے شہر میں جو رمزیت ہے اس کا ادراک وسیع معنوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شہر کو ایک مثبت اور معنی خیز معنوں میں استعمال کیا ہے۔ زندگی کے بہتر امکانات اور نتائج، معاشرہ کے مثبت فکر وعمل اور تہذیبی اقدار کے معنوں میں شہر کے استعمال سے شاعری کے تلازمہ میں نئی شعریت پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے شہر کو کبھی پیچیدہ مفہوم سے آراستہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ان کا یہ شہر دنیا کے ہر علاقے میں مل جائے گا جہاں لوگ خوش رنگ زندگی گزارتے ہیں اور کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ اسی شہر کی تلاش میں عمر بھر سرگرداں رہے۔ ان کا شہر جو کبھی اجڑ چکا تھا پھر کہیں نہیں ملا۔ وہ اس جستجو میں رہے کہ ان کو اپنے شہر جیسا کوئی شہر مل جائے لیکن وہ اس کے لئے ترستے رہے۔ پھر بھی امید یہ بندھی رہی کہ ایک نہ ایک دن وہ شہر ضرور ملے گا جس کی شناخت کب کی مٹ چکی ہے۔ میرؔ کو اپنے شہر دلّی کے اجڑنے کا رنج تھا اور ناصؔر کاظمی کو اپنے شہر کی نشانیاں مٹ جانے کا کرب۔ دلی کی تباہی اور بربادی کا نقشہ میرؔ نے بہت ہی عمدہ طریقے سے کھینچا ہے۔ دوسری طرف ناصؔر کاظمی نے بھی ہندوستان سے اپنی ہجرت کو 'زندہ دلان لاہور' میں پیش کیا ہے۔ یوں تو ناصؔر کاظمی نے اپنے شہر کی رونق کو تھوڑا بہت محسوس کیا اور اپنے دل کو اس دھرتی سے ہٹا کر دیکھا، اسے احساس ہوا کہ شاید یہ اسی کا شہر ہے لیکن بعد میں ارباب سیاست کی بدولت شہر کی روشنی سمٹتی گئی اور تاریکی نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔ اس بے رونقی کو دیکھ کر شاعر چیخ اٹھا۔

وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

گویا ناصؔر کاظمی کے یہاں شہر محض ایک شہر ہی نہیں بلکہ ایک المیہ بھی تھا جس کی کربناکی کو انہوں نے اپنے

بہت سے شعروں میں بیان کیا۔ مثلاً چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

کس سے کہوں کوئی نہیں سو گئے شہر کے مکیں　　کب سے پڑی ہے راہ میں میتِ شہر بے کفن

شہر میں اب ہمارے چرچے ہیں　　جگمگاتے ہیں کاخ و کو ہم سے

کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا　　وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہر رعنائی

ناصؔر کاظمی کے بنیادی شعری محرکات میں عشق، شہر، رات، تنہائی، یاد اور یادِ رفتگاں قابل ذکر ہیں۔ رات اپنے وسیع تر معنی میں ناصؔر کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ شاعر ناصؔر کاظمی کو اسی لیے 'رات' کا بے نوا مسافر کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ رات کی جتنی مسافت ناصؔر نے طے کی ہے شاید ہی کسی نے کی ہو۔ آیئے 'رات' کی ان کثیر جہتوں کو اشعار میں ڈھونڈتے ہیں۔

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی ستم گروں کی پلک نہ بھیگی　　نالہ اٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصؔر　　تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

لفظ 'تنہائی' بھی ناصؔر کے یہاں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ تنہائی ایسی چیز ہے جو ہر شخص کو ڈستی ہے۔ ناصؔر کے مطابق اگر تنہائی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ تنہائی سے ہر شاعر کو گزرنا پڑتا ہے کیونکہ تنہائی ہمیشہ سے شاعروں کا مقدر رہی ہے اور تنہائی میں ہی بہتر تخلیق کی توقع کی جاسکتی ہے۔ انسان ہمیشہ آزادی کا طلب گار رہتا ہے لیکن جب تک وہ تنہائی سے اقرار نہیں کر لیتا اسے سکون نصیب نہیں ہوسکتا۔ تنہائی کی مختلف تہیں ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں موجود ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ۔

تنہائی مرے دل کی جنت　　میں تنہا ہوں میں تنہا تھا

ان سے الجھ کر بھی کیا کرلیتا　　تین تھے وہ اور میں تنہا تھا

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کر سو جاتی ہیں　　ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے ہیں

یاد اور یادِ رفتگاں تو ناصؔر کاظمی کا بنیادی تخلیقی محرک (Motive) ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں شاعر گزرے

دنوں کو یاد کرتا ہے۔ اس کا سراغ لگاتا ہے اور ماضی کی تلاش کرتا ہے۔ یاد ماضی، یاد رفتگاں، یاد محبوب کی مختلف کیفیتوں سے ناصؔر کی غزلیں سرشار ہوتی ہیں جو دلوں کے تار کو چھیڑ کر گئے دنوں کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں۔ آیئے آپ بھی ان کی یاد ماضی کے درد و کرب اور کھوئی ہوئی ایک کائنات کو محسوس کیجئے۔

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار   یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں
ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں   ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں اداسی، بے زاری، بے گھری اور تلاش و جستجو خوب مگر محتاط انداز فکر اختیار کیے ہوئے ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے اس حوالے سے یہ اشعار۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر   اداسی بال کھولے سو رہی ہے
خوشبوؤں کی اداس شہزادی   رات مجھ کو ملی درختوں میں

ناصؔر کی شاعری کا ایک اسلوب ایسا بھی ہے جس پر فارسیت غالب ہے، ان کے بہت سے اشعار میں فارسی تراکیب کے عمدہ نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں یعنی اردو غزل میں فارسی تراکیب کے استعمال کی جو روایت رہی ہے اس سے ناصؔر کاظمی آشنا ہیں۔ خوبصورت اور برمحل فارسی تراکیب سے ان کے کلام میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر بعض نقاد ناصؔر کاظمی کو غالبؔ سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ہماری اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔

ہم سے پہلے زمینِ شہرِ وفا   خاک تھی کیمیا ہمیں سے ہوئی
ہر سحر بار گاہ شبنم میں   پھول ملتے ہیں باوضو ہم سے

فارسی کی بوجھل تراکیب سے پاک ناصؔر کاظمی کی شاعری کا ایک وصف خاص ان کی برجستگی بھی ہے جو ان کے گداز ہنر کو واضح کرتی ہے۔ یہ شعر دیکھئے۔

دل تو میرا اداس ہے ناصؔر   شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

گُنج میں بیٹھے ہیں چپ چاپ طیور　　برف پگھلے گی تو پر کھولیں گے

جنگل، راستہ، رات، نیند، دشت، صحرا، جزیرے، پانی، خوشبو، چاند، چاندنی، خیمہ، خالی کمرہ، حویلی، گلی، شہر، تنہائی، چراغ، شجر، دیوار، دھوپ، آنگن، خالی ہاتھ، بارش، جھیل، پہاڑ وغیرہ ناصؔر کاظمی کی شاعری کے بلیغ استعارے ہیں جن کے استعمال سے ایک نئی شعری فضا قائم ہوتی ہے اور نئی شاعری کی تفہیم میں آسانیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھئے۔

رستوں میں اداس خو شبوؤں کے　　پھولوں نے لٹا دیے خزانے

ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے　　جسم ہے یا چاندنی کا شہر ہے

بھیگ چلیں اب رات کی پلکیں　　تو اب تھک کر سویا ہوگا

ناصؔر کاظمی کا لسانی شعور بھی بہت پختہ ہے۔ اتنا پختہ کہ لفظوں میں اس کا درک شامل ہے۔ وہ اپنی شاعری میں لفظوں کے استعمال میں حد درجہ احتیاط برتتے ہیں اور ایسے الفاظ کو کبھی نہیں چھوتے جو غیر مانوس اور فصیح نہیں ہوتے۔ ناصؔر کاظمی کا پہلا شعری مجموعہ 'برگِ نے' میں عشق غالب رہا تو دوسرے مجموعہ کلام 'دیوان' کی شاعری پوری طرح جذباتیت سے عاری ہے اور ذات حاوی ہوگئی ہے۔ ذات کی کربنا کی زیادہ وسیع نظر آتی ہے۔ فلسفہ بھی بہت کم ہے۔ جبکہ تیسرے مجموعے 'پہلی بارش' میں بھی اجتماعی شعور کا درک بہت کم ہوتا ہے اور پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں مل جاتی ہیں۔ ان میں پیکر اور علامت دونوں ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ بعد کی غزلوں میں پیکر تراشی سے ان کا شاعرانہ کمال اور واضح ہو جاتا ہے۔ اس تعلق سے چند اشعار۔

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں　　وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں　　وہ پانی کتنا گہرا تھا

کتنا چپ چپ، کتنا گم سم　　وہ پانی باتیں کرتا تھا

ناصؔر کی اصل شناخت ان کی غزلوں سے ہوتی ہے لیکن انہوں نے کم عمدہ نظمیں بھی نہیں کہی ہیں۔ ان کی

نظموں کا مجموعہ 'نشاطِ خواب' ہے جس میں 'شہرِ غریب' 'نیا مسافر، بارش کی دعا، گھر پھولوں کے، ساتواں رنگ، جیسی عمدہ نظمیں موجود ہیں۔ ناصرؔ کاظمی نے شاعری کے علاوہ مضامین بھی لکھے ہیں اور 'سُر کی چھایا' جیسا خوبصورت طویل ڈراما بھی لکھا جو ہر اعتبار سے شاعری ہی معلوم ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ ناصرؔ کاظمی ایک مخصوص لہجے کے شاعر تھے۔ ان کا تعلق اس عہد سے تھا جب ترقی پسندی پورے معاشرے پر غالب آ چکی تھی اور شاعری میں خارجیت اور مقصدیت کا بول بالا تھا۔ بلند آہنگی اور ہنگامہ آرائی میں شاعری گم ہو کر رہ گئی تھی۔ تخلیقی قوت متاثر ہو رہی تھی، انقلاب اور بغاوت کی آوازیں تیز ہو چکی تھیں۔ اس عہد میں ناصرؔ کاظمی نے اردو غزل کی آبرو کو بچائے رکھا۔ 1960ء کے آس پاس جدیدیت کا رجحان فروغ پایا تو شاعری میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مقصدیت کم ہوئی اور ہیئت کے تجربے خوب ہوئے لیکن اس شور میں بھی ناصرؔ کاظمی نے خود کو گم ہونے نہیں دیا اور بڑی متانت و سنجیدگی کے ساتھ وہ شاعری کرتے رہے۔ جن شعراء نے ہندو پاک کے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا ان میں ناصرؔ کاظمی سرِ فہرست ہیں۔ ان کی سادگی اور سچائی ایسی ہے کہ اردو شاعری انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ان کا یہ شعر کتنا پُر کشش ہے جو ان کے قد کو بلند کرتا ہے۔

دائم آباد رہے گی دنیا ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. غزل کا کلیدی موضوع کیا رہا ہے؟

5. ناصرؔ کاظمی کے یہاں کون کون سے بنیادی شعری محرکات ہیں؟

6. ناصرؔ کاظمی کی شاعری میں کچھ بلیغ استعاروں کی نشاندہی کیجیے۔

6.5 ناصرؔ کاظمی کی غزل (1)

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر　　سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو　　تھوڑی سی خاک کوچۂ دلبر ہی لے چلیں
یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی　　گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں　　آ، اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

6.5.1 مجموعی تاثر

ناؔصر کاظمی کی یہ غزل بے حد مقبول و معروف ہے جو ان کی شعری بصیرت کو واضح کرتی ہے۔ اس غزل میں شہر، گھر، گلی، کوچۂ دلبر، ستم گر، دھوپ، سفر، خاک، چراغ، نشانی اور شبِ فراق وغیرہ وہ کلیدی الفاظ ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں ان کی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ دراصل یہ ناؔصر کاظمی کے بنیادی شعری محرکات بھی ہیں۔ عشق کے موضوع کو ناؔصر کاظمی نے خوب برتا ہے۔ اس غزل میں بھی عشقیہ شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ کڑی دھوپ کے سفر کو طے کرنے کے لیے سر پر خیالِ یار کی چادر لے جانا عشق کی محبت کو بیان کرتا ہے۔ رنج سفر کی نشانی کے طور پر کوچۂ دلبر کی خاک اور ستم گر کے شہر کی یادگار کے طور پر پتھر لے جانے کی بات ان کی شاعرانہ خصوصیات میں شامل ہے۔ شہر بے چراغ اور نشانی کا ذکر کر کے شاعر اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ زبان و بیان اور موضوع کے اعتبار سے ناؔصر کی یہ غزل بہت عمدہ ہے۔ جس سے ان کے شعری اظہار کے رویے کا بخوبی اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

6.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: ناؔصر کاظمی کی یہ غزل ان کے مجموعہ کلام 'دیوان' میں شامل ہے۔ غزل کے اس مطلع میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دل میں بہت سے ارمان اور بہت سی خواہشات لے کر محبوب کے شہر میں آئے لیکن محبوب روایتی ستم گر ہے اور اس نے عرضِ تمنا پر سنگ باری کی۔ اب وہی پتھر یادگار کے طور پر لے کر شاعر واپس گھر آنا چاہتا ہے تا کہ پتھر کو دیکھ کر اسے معشوق یاد آئے اور اس کا عشق تازہ ہو۔ اس شعر میں شاعر نے ظلم ڈھانے والے محبوب کے شہر کو 'شہر ستم گر' کہا ہے۔

ناصؔر کاظمی کی شاعری میں شہر اور گلی کی علامت ایک آفاقی استعارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں جن میں شہر اور گلی جیسے الفاظ کے استعمال سے ان کی تخلیقی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ دراصل ان الفاظ کے سہارے شاعر نے اپنی مایوسی، اپنی شکست اور اپنی تنہائی کے کرب کو شعری پیکر عطا کر کے اپنے تجربات سے روشناس کرایا ہے۔ ستم گر اور پتھر کا قافیہ خوب ہے۔ جس سے مفہوم کی ادائیگی میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یہ شاعر کا دکھ ہی ہے جو شہر اور گلی کے تصور کو آفاقیت کا لباس پہنایا ہے۔ اس قسم کے کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اِک دن　　تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

تیری گلی میں سارا دن　　دکھ کے کنکر چنتا ہوں

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصؔر　　کہ دن کو بھی مرِے گھر میں وہی اداسی ہے

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات　　یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

بظاہر اس شعر میں ستم شعار کے شہر سے بطور یادگار پتھر لے جانے کی بات کہی گئی ہے لیکن ان کا معنوی انسلاک زندگی کے بہتر شب و روز سے ہے، یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب زندگی ایک نئی آب و تاب سے گزر رہی تھی لیکن کچھ ہوا ایسی چلی کہ سارے خوش رنگ شہر تباہ کر دیے گئے۔ ایسی صورت میں یادگار کے طور پر شہر ستم گر سے پتھر لے جانے کی خیال آرائی میں بڑی معنی خیزی شامل ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ معشوق کے بغیر ایک دن بھی گزارنا مشکل ہے اور میرے سامنے زندگی کا جو سفر ہے وہ کڑی دھوپ سے عبارت ہے۔ ایسی صورت میں زندگی کاٹنا محال سا ہو گیا ہے۔ اس لیے اب کچھ نہیں تو خیال یار کی چادر سے ہی کام چلایا جائے۔ خیال یار کی چادر کی چھاؤں سے دھوپ کی تمازت کم ہوگی۔ ناصؔر کاظمی نے اپنی اس خیال آرائی سے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس شعر میں کڑی دھوپ کے سفر میں خیالِ یار کی چادر سے طمانیت حاصل کرنے کی بات بہت عمدہ ہے۔ یہ شعر خیال آرائی کی بلندیوں کو

چھور ہا ہے۔شاعر یہ کہتا ہے کہ اس کی زندگی کا سفر جو کڑی دھوپ کی نذر ہو چکا ہے خیال یار کی چادر اوڑھنے سے ہی اس کی تمازت کا احساس نہیں ہوگا۔اس لیے کچھ نہیں تو اپنے محبوب کو خیالوں میں بسالیں کہ اس کی یادوں کی ایک چادر بن جائے اور جب ایسا ہوگا تو اسے اپنی زندگی کاٹنے میں آسانی ہوگی۔

تیسرا شعر: ایک بار پھر شاعر اپنے محبوب کی گلی کا ذکر کر رہا ہے، اسے اس بات سے کسی حد تک یقین ہو چلا ہے کہ دلبر کے کوچہ کی اگر تھوڑی مٹی ہی لے کر جب وہ واپس لوٹے گا تو اسے ایک نشانی سمجھ کر وہ اپنے محبوب کو بار بار یاد کرے گا۔یعنی شاعر یہاں تک اپنے محبوب سے مانوس ہے کہ اسے اس کی گلی کی خاک بھی اچھی لگتی ہے۔دراصل اس شعر کے حوالے سے سفر میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں اور جو تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں ان کی نشانی کے طور پر معشوق کی گلی کی تھوڑی سی مٹی لے جانے کی بات کہی گئی ہے۔شاعر اس بات سے خوف زدہ بھی ہے کہ اگر ہم نے نشانی کے طور پر خاک نہیں لی تو شاید یہ خاک بھی کبھی نصیب نہ ہو۔اسی لیے تو وہ یہ کہنے پر بھی مجبور ہے کہ ؎

یہاں اک شہر تھا شہرِ نگاراں　　نہ چھوڑی وقت نے اُس کی نشانی

چوتھا شعر: شاعر نے اس شعر میں اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اس کی دل گرفتگی یہ کہہ کر اکثر وبیشتر چھیڑتی ہے کہ اگر وہ پریشان ہے تو اس کی دل گرفتگی اسے باہر کی ہوا کھلائے تاکہ اس کا غم جاتا رہے۔دراصل عاشق قید تنہائی میں ہے اور معشوق کی فرقت میں دل گرفتہ ہے۔نہ کوئی مونس اور نہ کوئی عہد و پیمان۔لے دے کے دل گرفتگی ہی کا ساتھ ہے جو یہ کہتی ہے کہ تنہائی سے گھبرا گئے ہو تو تمہیں باہر نکلنا چاہئے کہ شاید دل گرفتگی کا علاج ممکن ہو سکے۔اردو شاعری کی روایت یہ رہی ہے کہ دیوانگی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو عاشق جنگل کی طرف رخ کرتا ہے، یہاں ناصؔر کاظمی نے کچھ اسی قسم کا اشارہ کیا ہے جس سے شعر میں معنی خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

پانچواں شعر: ناصؔر کاظمی کا یہ شعر دل کے تار کو جھنجھوڑتا ہے۔کیونکہ اس کے ذہن میں جو شہر تھا وہ کب کا تباہ و برباد ہو چکا ہے، لٹ چکا ہے۔شاعر نے جس شہر کی رونق کو برقرار رکھنے کے لئے دعا مانگی تھی اور راتیں جاگ جاگ کر کاٹی تھیں وہ شہر بے چراغ ہو گیا ہے۔یعنی خوشحال شہر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ اس شہر کے سارے چراغ بجھ گئے

اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ شاعر کو جب یہ محسوس ہوا کہ اب شہر کے چاروں طرف سناٹا ہے، بڑے بڑے دل کے انسان کب کے مردہ ہو چکے، انہیں اب جگانے والا کوئی نہیں رہا تو شاعر اپنے قلم کی آبرو کا خیال کرتے ہوئے شب فراق سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ اس اجڑے ہوئے شہر میں (جسے غم کی فوجوں نے تاراج کر دیا ہے) تجھے کہاں لے جائیں آ تجھے اپنے گھر ہی لے چلیں جو تاریکی میں ہی سہی گھر تو ہے۔ شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ اب شہر میں کوئی چراغ نہیں جلتے۔ اب کوئی خوشی نہیں اور نہ ہی انتظار میں وہ مزہ ہی رہا، اس لیے اے شبِ فراق تجھے اپنے گھر ہی لے کر چلیں کہ کم از کم وہ گھر تو ہمارا ہے۔ جہاں اب تنہائی کا ڈیرہ ہے۔ غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناصؔر کاظمی کی شاعری میں رات، ہجر، سحر اور چراغ جیسے الفاظ سے زندگی کے تجربات کی ایک نئی بستی آباد ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مثلاً اس قبیل کے کچھ اور شعر ملاحظہ کریں، آپ کو ان لفظوں کی وسعتِ بیان کا اندازہ بھی بخوبی ہو جائے گا۔

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی — مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے
میں تو ہلکان ہو گیا ناصؔر — مدت سحر کتنی پھیل گئی
میرا دیا جلائے کون — میں ترا خالی کمرہ ہوں
رین اندھیری ہے اور کنارا دور — چاند نکلے تو پار اتر جائیں

درحقیقت ناصؔر کاظمی کا تجربہ کسی عہد کا پابند نہیں ہے بلکہ ہر عہد کا ترجمان لگتا ہے۔ اور یہ خوبی ان کی انفرادیت کو مستحکم کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا اسلوب روایتی شعر گوئی کو رد نہیں کرتا بلکہ ایک نئی زمین ہموار کرتا ہے جس سے ناصؔر کاظمی کی شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. 'شہرِ ستم گر' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

8. درج بالا غزل ناصؔر کاظمی کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

6.6 ناصر کاظمی کی غزل (2)

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی — برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ — اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا — گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا — یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود — محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

6.6.1 مجموعی تاثر

ناصر کاظمی کی یہ دوسری غزل بھی پہلی غزل کی طرح بے حد مقبول ہے۔ انتہائی سادگی اور سچائی سے شاعر نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ اس غزل کا تیور بھی ناصر کاظمی کا اپنا ہے۔ مجموعی اعتبار سے اس غزل کا مزاج عشقیہ ہے اور اس میں بلند آہنگی کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ ناصر کاظمی کے پہلے شعری مجموعہ 'برگِ نے' کی یہ پہلی غزل ہے جس سے عشق کی مختلف کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ محبوب کے نام سے کبھی کبھی وحشت اور طبیعت برہم ہونے کا ذکر، جوشِ جنوں میں درد کی طغیانی اور اشکوں میں محبوب کی صورت کے ڈھلنے کی بات عشقیہ غزل میں ایک نئے پن کا تاثر چھوڑتی ہے۔ اس طرح محبوب کے قریب ہونے کے باوجود دل کا مطمئن نہ ہونا نیز محبوب کے خیال کے بغیر شب فرقت کا گزر جانا اور اپنے دوست سے ترکِ محبت کے باوجود اس کی ضرورت کو محسوس کرنے کا غزل کا بالکل یہ ایک نیا تجربہ ہے جسے ناصر نے برتا ہے۔ غزل کی لفظیات عام فہم ہیں، ساتھ ہی یہ غزل روایت سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

6.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: شاعر اپنے محبوب کی بے وفائی سے نالاں ہے، وہ ستم پر ستم سہہ چکا ہے۔ اس کا عشق کا تجربہ کافی گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے محبوب سے یہ کہنے پر مجبور ہے کہ تیرے نام سے مجھے کبھی کبھی وحشت ہونے لگتی ہے اور طبیعت بھی برہم ہوئی جاتی ہے۔ لیکن معشوق سے اپنی برہمی کا اظہار کرنا شاعر کی محبت کو ہی واضح کرتا ہے۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ عشق اور محبت کے جنون میں اتنا درد اٹھا کہ طغیانی آ گئی اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ نتیجتاً محبوب کی صورت میرے آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ دراصل ناصؔر کاظمی نے عشق کو بڑی سنجیدگی سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ عشق کا جنون اتنا بڑھ جاتا ہے کہ کبھی کبھی حسب توقع کامیابی ہاتھ نہیں آتی اور درد زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہی حال ناصؔر کا بھی ہوا ہے۔ تبھی تو محبوب کی صورت اشکوں میں ڈھل جاتی ہے۔

تیسرا شعر: یہ شعر بڑا نازک ہے۔ محبوب جب قریب ہوتا ہے تو پھر دنیا کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ زندگی قیامت سی نہیں لگتی۔ لیکن شاعر کا کہنا ہے کہ میرا محبوب میرے قریب تھا پھر بھی میرا دل مطمئن نہیں تھا یعنی اسے جو خوشی اور انبساط حاصل ہونی چاہئے تھی وہ نہ ہوسکی اور اس کیفیت کو ناصؔر کاظمی نے قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ خیال بالکل اچھوتا ہے کہ محبوب کے پاس رہنے کے باوجود دل کو اطمینان حاصل نہیں۔

چوتھا شعر: یہ بھی غزل کا خالص شعر ہے۔ شبِ فرقت یعنی رات کی تنہائی میں محبوب کا خیال نہ آئے اور اپنا ہوش بھی نہ رہے، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ تنہائی ہمیشہ ماضی کو جنم دیتی ہے اور بقول ناصؔر کاظمی تنہائی کی کوکھ سے ہر شئے پیدا ہوتی ہے تو پھر رات کی تنہائی میں محبوب کا خیال شاعر کو کیوں نہیں آیا اور اسے اپنے ہونے کا بھی پتہ نہیں چلا۔ ظاہر ہے یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب کسی پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑے یا پھر اس پر فرقت کا صدمہ غالب آ جائے۔ ناصؔر کاظمی نے بالکل منفرد انداز میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے۔

پانچواں شعر: ناصؔر کاظمی کا یہ زبان زد خاص و عام شعر ہے۔ ادب کا شاید ہی کوئی سنجیدہ قاری ہو جسے یہ شعر یاد نہ ہو۔ محبوب سے رشتہ منقطع کرنے کے بعد اس کی ضرورت کو کبھی کبھی ہی سہی محسوس کرنا کم کربناک احساس نہیں ہے۔ دراصل شاعر کا یہ وہ جذبہ ہے جو اس کے عشق کو زندہ رکھتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ محبت میں چاہے کچھ بھی ہو جائے، ترک تعلق ہو جائے یا پھر علیحدگی کچھ بھی ہو جائے لیکن محبت یاد آتی ہے اور معشوق کی چاہت میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شعر محبوب سے محبت کی انتہا کو بیان کرتا ہے، تبھی تو اسے برسوں ہو گئے ترک محبت کیے ہوئے مگر دوست کی یاد آتی ہے اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

6.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے نئی اردو غزل کے ایک معتبر شاعر ناصؔر کاظمی کی حیات اور غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا اور ان کی زندگی کے نشیب وفراز، شوق، تعلیم، ملازمت وغیرہ کا سنجیدہ مطالعہ کیا۔ ناصؔر کاظمی 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں اپنے نانیہال میں پیدا ہوئے۔ وہ ابھی بی اے میں تھے کہ ملک تقسیم کے سانحہ سے دو چار ہوا۔ حالات اتنے بگڑے کہ ان کے خاندان کو لاہور ہجرت کرنی پڑا۔ ہجرت سے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے ریڈیو لاہور میں کچھ دنوں ملازمت کی اور مختلف ادبی رسائل کی ادارتی ذمّہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ ناصؔر کاظمی کے شعری مجموعے 'برگِ نے'، 'دیوان'، 'نشاط خواب'، 'پہلی بارش اور ایک طویل منظوم ڈراما 'سر کی چھایا' منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کی کچھ نثری تصانیف بھی بطور یادگار موجود ہیں۔ کینسر کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی اور انہوں نے 2 مارچ 1972ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

اس اکائی میں ناصؔر کاظمی کی غزلیہ شاعری کی چند اہم خصوصیات اور بنیادی شعری محرکات پر گفتگو کی گئی۔ عشق، رات، شہر، یاد، یادرفتگاں، تنہائی وغیرہ کو بطور خاص موضوع بحث لایا گیا تا کہ ان کی غزل گوئی کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ مناظر فطرت اور عشق دونوں سے ان کی دلچسپی اور موسیقی اور مصوری سے گہرے لگاؤ کا عکس ان کی غزلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے میؔر، غالبؔ، فراقؔ وغیرہ کا اتباع کیا اور کلاسیکی شاعری کا احترام کرتے ہوئے جدت افروزی کو خوب پروان چڑھایا۔ نئی نئی اصطلاحیں، نئے نئے تلازمات، استعارے وتشبیہات اور علامات سے اپنی شاعری کو ایک نیا جہان معنی عطا کیا۔ اس اکائی میں ناصؔر کاظمی کی دو غزلیں بطور نمونہ پیش کی گئیں اور ان غزلوں کے تمام اشعار کی تشریح بھی کی گئی اور ان کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا۔ اپنے مطالعہ کی جانچ کے ساتھ امتحانی سوالات بھی پیش کئے گئے اور مختصر سوالات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں نیز کچھ مشکل الفاظ کے معنی فرہنگ میں شامل ہیں۔ آخر میں ناصؔر کاظمی کی شاعری سے متعلق مزید معلومات میں اضافہ کے لیے کچھ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ یقیناً ان

سفارش کردہ کتابوں سے مطالعہ کی تشنگی کم ہوگی اور ناصؔر کاظمی کی شعری قدر و قیمت کے تعین میں ان سے مدد ملے گی۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. ناصؔر کاظمی کے شوق، تعلیم اور ملازمت وغیرہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. ناصؔر کاظمی کی غزلوں میں فارسی کے اثرات کی نشاندہی کیجیے۔
3. ناصؔر کاظمی کی شعری ونثری تصنیفات کے بارے میں اپنی معلومات سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. ناصؔر کاظمی کی مختصر سوانح حیات بیان کیجیے۔
2. ناصؔر کاظمی کی عشقیہ شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
3. ناصؔر کاظمی کی غزلیہ شاعری کے امتیازی نکات بیان کیجیے۔

6.9 فرہنگ

بصیرت	بینائی، دل کی بینائی، عقلمندی، رائے خیال
برگزیدہ	منتخب، چنا ہوا، پسندیدہ
آشوب	ہلچل، فتنہ وفساد، پریشانی، شور
انتشار	پراگندگی، تتر بتر ہونا، منتشر ہونا
مٹر گشتی	آوارگی، ہوا خوری
خزاں	پت جھڑ، وہ موسم جس میں پتے جھڑتے ہیں
بے سروسامانی	غریبی، مفلسی
سحر	صبح، فجر، تڑکا

عمیق	گہرا
شکست وریخت	ٹوٹ پھوٹ، نقصان، ہارا ہوا
تگ ودو	کوشش، سعی، دوڑ دھوپ
گجر	گھنٹے یا گھڑیال کی آواز
نشیب وفراز	اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ
معنویت	باطن پن
مصائب	مصیبت کی جمع، تکلیفیں، بلائیں
افسردگی	کملاہٹ، پژمردگی، مایوسی
بساط	طاقت، سرمایہ، بستر
سوختہ	جلا ہوا، بجھا ہوا، مصیبت زدہ
آفاقی	ساری دنیا کا، عالم گیر
صرصر	آندھی، بادِ تند

6.10 معاون کتابیں

.1	ناصؔر کاظمی ایک دھیان	شیخ صلاح الدین
.2	ناصؔر کاظمی کی شاعری	حامدی کاشمیری
.3	کلیاتِ ناصر	ناصؔر کاظمی
.4	معاصر اردو غزل	پروفیسر قمر رئیس (مرتب)

6.11 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

.1 ناصؔر کاظمی کا اصل نام سید ناصؔر رضا ہے۔ وہ 8 دسمبر 1925ء کو انبالہ میں اپنے نانا کے مکان 'کنیز

منزل، محلّہ قاضی واڑہ میں پیدا ہوئے۔

2. ناصؔر کاظمی کے شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں: 'برگِ نے'، 'دیوان'، 'پہلی بارش'، 'نشاطِ خواب' اور 'سر کی چھایا'۔

3. ناصؔر کاظمی 'اوراقِ نو'، 'ہمایوں'، 'خیال'، 'ہم لوگ' رسالوں سے وابستہ رہے۔

4. ''عشق'' غزل کا کلیدی موضوع رہا ہے۔

5. ناصؔر کاظمی کے بنیادی شعری محرکات میں عشق، شہر، رات، تنہائی، یاد اور یادِ رفتگاں قابلِ ذکر ہیں۔

6. جنگل، راستہ، رات، نیند، دشت، صحرا، جزیرے، پانی، خوشبو، چاند، چاندنی، خیمہ، خالی کمرہ، حویلی، گلی، شہر، تنہائی، چراغ، شجر، دیوار، دھوپ، آنگن، خالی ہاتھ، بارش، جھیل، پہاڑ وغیرہ ناصؔر کاظمی کی شاعری کے بلیغ استعارے ہیں۔

7. شہرِ ستم گر سے شاعر کی مراد وہ شہر جو ظلم ڈھانے والے محبوب کے شہر سے ہے۔

8. متن کی پہلی غزل 'کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر' ناصؔر کاظمی کے مجموعہ کلام 'دیوان' میں شامل ہے۔

بلاک نمبر-3
نظم

اکائی ۷۔نظم کی تعریف، بنیادی خصوصیات، ابتدا اور مختصر تاریخ
اکائی ۸۔اختر شیرانی۔'او دیس سے آنے والے بتا'
اکائی ۹۔اسرار الحق مجاز۔' آوارہ'

اکائی 7 : نظم کی تعریف، بنیادی خصوصیات، ابتدا اور مختصر تاریخ

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 نظم کی تعریف اور خصوصیات

10.4 نظم کی ہیئت

10.5 نظم کا موضوع

10.6 اُردو نظم کا آغاز وارتقا

10.7 جدید نظم کا آغاز

10.8 اہم نظم نگار شعرا (1936ء سے پہلے)

10.8.1 شبلی

10.8.2 سرورؔ جہان آبادی

10.8.3 علامہ محمد اقبالؔ

10.9 اہم نظم نگار شعرا (1936ء کے بعد)

10.9.1 فیض احمد فیضؔ

10.9.2 مخدوم محی الدین

10.9.3 اسرار الحق مجازؔ

10.9.4 ساحرؔ لدھیانوی

10.9.5 سلامؔ مچھلی شہری

10.9.6 سردارؔ جعفری

10.9.7 کیفیؔ اعظمی

10.9.8 اختر الایمان

10.9.9 ن۔م راشدؔ

10.9.10 میراجی

10.10 اُردو نظم 1960ء کے بعد

10.11 خلاصہ

10.12 نمونہ امتحانی سوالات

10.13 فرہنگ

10.14 معاون کتابیں

10.15 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

10.1 اغراض ومقاصد

آپ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے زمرے میں مختلف اصناف کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وغیرہ۔ نظم بھی اردو شعروادب کی ایک اہم شاخ ہے جسے بطور صنف کے قبول کیا جا چکا ہے۔ جس طرح آپ ناول اور افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں اسی طرح نظم کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے حقائق کو جب فکشن میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کے اثرات جس طرح انسانی ذہنوں پر مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح شاعری میں بالخصوص جب آپ نظموں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی اور تہذیب انسانی کے کیسے کیسے موضوعات کو نظم کے پیکروں میں پیش کیا گیا ہے۔ نظم کے مطالعے سے یہ بھی کھلتا ہے کہ آخر غزل یا دوسری اصناف شعر سے، نظم کس طرح اور کن بنیادوں پر مختلف یا ممیّز ہے۔

10.2 تمہید

ہر صنف ادب کے وجود میں آنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ جس عہد میں جو صنف معرض وجود میں آتی ہے اُس پر اُس عہد کے تہذیبی تناظر کا خاص اثر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم کے ذیل میں وہ تمام اصناف آتی تھیں جو غزل سے الگ تھیں جیسے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ۔ لیکن ایسے میں ہمیشہ ایک طرح کا التباس رہتا تھا کہ اگر ایسا ہے تو پھر قصیدہ، مثنوی یا مرثیہ میں سے کس کی ہیئت قابل قبول ہوگی؟ اس سبق میں ان امور پر بحث کی جائے گی۔

10.3 نظم کی تعریف اور خصوصیات

نظم کی کوئی مکمل تعریف اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ کبھی نثر کی ضد کی طور پر نظم کا استعمال ہوا تو کبھی غزل کے علاوہ دوسری تمام اصناف پر نظم کا اطلاق ہوتا رہا۔ جیسے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، شہرآشوب، مسدس، مخمس وغیرہ۔ لیکن ہم جس صنف ''نظم'' کی بات کرر ہے ہیں اس کی اپنی الگ شناخت ہے۔ نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اس میں جذبات یا تاثرات کی تجزیاتی پیش کش۔ یہ انفرادی بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی بھی۔ اس کی تعریف کچھ یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسی منظوم تخلیق جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور جس میں ارتقائی عمل کارفرما ہو۔ حالانکہ یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ ایک اختتام رکھنے کے باوجود نظم میں ارتقا ہو، ضروری نہیں۔ مرکزی خیال کا ہونا نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اور ربط و تسلسل بھی، لیکن نئی نظموں میں اس کی نفی بھی ہوتی رہی ہے۔

10.4 نظم کی ہیئت

اس نظم کی ہیئت طے نہیں۔ اس کی ہیئتی شکل کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ نظم مثنوی، مسدس، مخمس، مربع، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد، آزاد، معرّا اور اب نثری ہیئتوں میں کہی جاسکتی ہے۔ ان تمام ہیئتوں میں نظم کے نمونے موجود ہیں۔ آج کل پابند نظمیں کم کہی جارہی ہیں۔ زیادہ تر آزاد اور نثری نظمیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ لیکن اگر ہم نظم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، سردار جعفریؔ، ساحرؔ لدھیانوی، مختارؔ صدیقی، ضیاؔ جالندھری، اختر الایمان وغیرہ کے یہاں مثنوی، مسدس، ترجیع بند، معرا اور آزاد نظمیں خوب ملتی ہیں۔ جدید نظم نگاروں میں ن۔ م۔ راشدؔ، میراجی، احمد ہمیشؔ، محمد علوی، افتخار جالبؔ، زاہدؔ ڈار، باقرؔ مہدی، انیسؔ ناگی وغیرہ نے نظم کی ہیئتوں میں نئے نئے تجربے کیے۔

10.5 نظم کا موضوع

نظم کے لیے کسی موضوع کی تخصیص نہیں۔ حسن و عشق سے لے کر مناظر قدرت، سماجی مسائل سے لے کر

حالات حاضرہ تک کے تمام موضوعات کبھی انفرادی تو کبھی اجتماعی احساس بن کر اردو نظم میں آتے رہے ہیں۔ ہندوستانی عناصر، جیسے یہاں کے میلے ٹھیلے، تیج تہوار، نظم میں آتے رہے ہیں۔تحریک آزادی اور انقلاب کو بھی نظم نگاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ 1960ء کے بعد کی نظموں میں جدید حسیت نے انفرادی احساس کو تنہائی، خوف، ذہنی انتشار وغیرہ سے ہم آہنگ کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. نظم کی تعریف کیا ہے؟
2. نظم کن ہیئتوں میں کہی جاتی رہی ہے؟
3. نظم کا موضوع کیا ہوسکتا ہے؟

10.6 اردو نظم کا آغاز وارتقا

نظم کا آغاز دکنی شاعری سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ دکنی دور میں نظم پہلے وجود میں آئی اور غزل بعد میں۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''دکن میں شاعری کو آغاز کار میں مذہبی اور تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا جس کے لیے غزل کے بجائے نظم زیادہ کارآمد تھی۔ دوسرے دکن میں بادشاہت کا نظام خاصا توانا تھا اور بادشاہ کی مدح کے لیے قصیدے کا رواج پا جانا ایک بالکل قدرتی بات تھی۔'' (اردو شاعری کا مزاج، ص 313)

قصیدے کا نام سن کر آپ کنفیوژن کا شکار نہ ہوجائیں۔شروع میں غزل کو چھوڑ کر دوسری تمام منظوم تخلیقات نظم کے زمرے میں آتی تھیں۔اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔مثنوی، قصیدہ، مرثیہ یہ تینوں اصناف گرچہ ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن ان میں جو کہانویت اور واقعیت ہوتی ہے یا پھر جو مرکزی خیال ہوتا ہے اس کے اعتبار سے بھی یہ اصناف ''نظم'' کو ہی Denote کرتی ہیں۔

دکنی شاعری میں بہمنی دور چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کوتسلیم کیا گیا ہے جو دوراول بھی ہے۔اس دور میں خواجہ بندہ نواز، گیسو دراز، نظامی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔تصوف اور مذہب کے مضامین ان کی نظموں میں حاوی ہیں۔دوسرے دور کوقطب شاہی اور عادل شاہی دور کہا جاتا ہے جوسولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کومحیط ہے۔اس عہد میں محمد قلی قطب شاہ،ابراہیم عادل شاہ،نصرتی،وجہی،غواصی،شوقی،ابن نشاطی،رستمی،ہاشمی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ان شعرامیں بیشتر نام مثنویوں کے لیے مشہور ہیں لیکن کچھ نے طبع زاد مثنویاں لکھیں تو کچھ نے فارسی سے ترجمے کیے۔اس زمانے میں رزمیہ شاعری بھی ملتی ہے۔اگر موضوعات دیکھیں تو عید، شب قدر، ولادت،محرم،شادی بیاہ، نوروز، پرندے،موسم برسات، بسنت،شاہی محل، عشق ومحبت اورتصوف یامذہبی امور جیسے واضح موضوعات ملتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو 18ویں صدی کے شروع میں ہی اردوادب دکن سے شمال یعنی دہلی کی طرف آمادۂ سفر ہوتا ہے۔1857ء سے پہلے تک کا دورنظم کے مقابلے میں غزل کی ترویج وترقی کا دور ہے۔غزل داخلی کیفیات واحساسات کی پیش کش کا اہم اور اثرانگیز ذریعہ رہی ہے۔چنانچہ اُس زمانے میں نظمیں مختلف ہیئتوں یعنی مثنویوں یاقصیدوں کی شکل میں ضرورت کے تحت لکھی جاتی رہیں لیکن غزل کوعروج حاصل رہا۔

1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سیاسی، سماجی،تعلیمی اور اقتصادی ماحول میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہندوستانیوں کے ذہن پراس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اسی زمانے میں اصلاحی تحریکیں بھی چلتی رہیں۔ بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی تہذیب اور زبان سے دوری اختیار کی،تو بہتوں نے انگریزوں کی تہذیبی وتعلیمی سطح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ’’بنے بنائے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہ تھے، پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا، نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔‘‘

(عکس اورآئینے،1962ء،ص115)

19ویں صدی کا یہ دور کشمکش کا دور تھا جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ ملتا ہے۔ اسی زمانے میں سرسید احمد خان نے ''تہذیب الاخلاق'' میں اپنے موقف کا اظہار کیا کہ ہمیں یورپین لٹریچر اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو آکسفورڈ اور کیمبرج جا کر بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کریں۔ اس ترغیب اور میلان سے ایک طرح کی بیداری پیدا ہوئی اور اس کا اثر ہر میدان میں نظر آنے لگا۔ جب انگریزی شاعری سے ہم آہنگی پیدا ہوئی تو اردو شعرا کو اپنی ابتذال پسندی اور فرسودگی کا احساس ہوا۔

10.7 جدید نظم کا آغاز

جدید نظم کے آغاز کا سہرا محمد حسین آزاؔد اور حالؔی کے سر جاتا ہے۔ آزاؔد نے 1867ء میں ''انجمن پنجاب'' کے جلسے میں انگریزی شاعری سے استفادے اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی لیکن اس سے پہلے غلام مولا قلق کی پندرہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ''جواہر منظوم'' کے نام سے 1864ء میں شائع ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں انگریزی نظموں سے استفادے کی ایک تحریک سی چل پڑی تھی جس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس حوالے سے آزاؔد، اسماعیؔل میرٹھی، حالؔی، نظؔم طباطبائی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ذرا سا آگے چلیں تو عبدالحلیم شرؔر، ضامنؔ کنتوری، سرؔور جہان آبادی، ناؔدر کاکوروی، عزیزؔ لکھنوی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

بہرحال انگریزی نظموں کے ترجمے سے اردو شاعروں کا میلان نظم کی طرف ہوا۔ اسی احساس نے محمد حسین آزاؔد کو بھی ایک باضابطہ تحریک کی طرف مائل کیا اور انھوں نے پہلے تو اگست 1867ء میں ایک تقریر کی جس کا عنوان تھا ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' اس کے بعد 19 / اپریل 1874ء میں ایک تقریر کے بعد ''شب قدر'' کے عنوان سے ایک نظم مثنوی کے فورم میں سنائی۔ اس جلسے میں کی گئی ان کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے:

> ''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لیے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے

آجکل چند نظمیں مثنوی کے طور پر لکھیں ہیں جنھیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں اور ایک مثنوی جورات کی حالت میں لکھی ہے گزارش کرتا ہوں۔''

(مجموعہ نظم آزاد)

مشہور محقق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے نظم ''شب قدر'' کو نئی شاعری کی پہلی نظم قرار دیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی

دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

روئے زمیں جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسے تو. رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

اس طرح موضوعاتی نظم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ واضح رہے کہ انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے کی مجوزہ تاریخ 30 رمئی 1874ء رکھی گئی اور جس کا موضوع ''برسات'' طے پایا۔ حالؔی نے اس میں ''برکھارُت''، نظم پیش کی جو جدید نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں فطری پن اور ربط و تسلسل قائم ہے، یہ بھی مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کوہسار

بھوبل سے سوا تھا رنگ صحرا
اور کھول رہا تھا آب دریا

تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

تھیں لومڑیاں زباں نکالے
اور لؤ سے ہرن ہوئے تھے کالے

اس کے بعد برسات کا ماحول تیار کیا جاتا ہے:

کل شام تک تو تھے یہی طور　　پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا　　اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے　　اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے

حاؔلی نے انجمن پنجاب کے دس مشاعروں میں سے صرف چار میں شرکت کی۔ ان مشاعروں میں انھوں نے برکھارُت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرۂ رحم وانصاف جیسی خوب صورت نظمیں پیش کیں۔ ان موضوعاتی نظموں کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر آل احمد سرؔور کے اس موقف سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

> ''برکھارُت'' اور ''حب وطن'' سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا کیوں کہ اس سے پہلے نظیؔر اکبرآبادی بھی اسے الاپ چکے تھے، مگر ان کی آواز کسی نے بھی نہ سنی۔ حاؔلی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا اور ان کی اور آزؔاد کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنا بہار دکھانے لگی۔''

(مضمون: ہندوستانی ادب میں حاؔلی کا درجہ، ماخوذ از تنقیدی اشارے، 1955ء، ص80)

نظیؔر اکبرآبادی کی نظموں کی اہمیت سے ہم آپ چشم پوشی نہیں کرسکتے۔ آزؔاد اور حاؔلی سے پہلے انھوں نے موضوعاتی نظمیں کہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آزؔاد اور حاؔلی یا اسماعیؔل میرٹھی یا قلقؔ میرٹھی یا نظمؔ طباطبائی وغیرہ کے سامنے انگریزی نظموں کے نمونے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے کے شعری مذاق پر ابتذال پسندی حاوی تھی اس لیے ضرورت تھی باضابطہ ایک تحریک کی۔ موضوعاتی نظمیں تو محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی نے بھی کہی تھیں لیکن اس وقت یہ مسئلہ قطعی نہیں تھا۔ اس لیے جدید نظم نگاری کے آغاز وارتقا میں آزؔاد اور حاؔلی کا اہم رول رہا ہے۔ یہی درست مانا گیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. جدید نظم کے آغاز کا سہرا کس کے سر ہے؟

5. انجمن پنجاب کے تحت پہلا مشاعرہ کب ہوا تھا؟

6. اس پہلے مشاعرے کا موضوع کیا تھا؟

10.8 اہم نظم نگار شعرا (1936ء سے پہلے)

اس حصّے میں ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے پہلے جن شعرا نے اردو نظم نگاری کے ارتقا میں اہم کردار نبھایا ان پر مختصراً روشنی ڈالی جائے گی۔ آزؔاد اور حالؔی پر چونکہ گفتگو ہو چکی ہے اس لیے ان کے بعد کے شعرا پر گفتگو ہوگی۔

10.8.1 شبلی

شبلؔی کو ہم ایک سیرت نگار، مقالہ نگار، تاریخ نگار اور علامہ کی حیثیت سے تو جانتے ہیں لیکن ان کے ادبی و شعری آثار پر گفتگو کم ہوتی ہے۔ جدید نظم کی تحریک سے وہ بھی متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے انگریزی زبان سے ناواقفیت کے باوجود منظوم ترجمہ ''رزمیہ کابل وقندھار'' پیش کیا۔ لیکن اصل چیز ہے ان کی ایک طویل نظم 'صبح امید' جو 353 اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ طویل نظم مثنوی کے فورم میں ہے جیسا کہ اس وقت کا چلن تھا۔ مسلم تہذیب و معاشرت، نئی تعلیم و ترقی اور زمانے کی ستم ظریفی اور قوم کی زبوں حالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے کس سمت زمانہ چل رہا ہے
پھونکا ہے فلک نے افسوں اب رنگ زمانہ ہے دگرگوں
ناچار ہیں، خستہ حال ہیں ہم عبرت کدۂ زوال ہیں ہم

آخر میں امید کی کرن ابھرتی ہے:

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی اس راکھ میں شرر ہیں اب بھی
گو خوار ہیں، طرز و خو وہی ہے مرجھا گئے پھول، بو وہی ہے

شبلی کی بیشتر نظموں میں وہی عظمت رفتہ کی کہانی یا مسلم قوم کی زبوں حالی کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے سامنے اصلاحی اور اخلاقی قدروں کی بازیافت اہم تھی۔ ان کی مشہور نظمیں قومی مسدس، ہجرت نبوی صلعم، مذہب یا سیاست، خلیفہ ابن عبدالعزیز کا انصاف، شہرآشوب اسلام، مساوات اسلام وغیرہ ہیں۔

10.8.2 سرورؔ جہان آبادی

درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کا نام اردو نظم نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ اصلاحی اور اخلاقی نظم نگاری سرورؔ جہان آبادی کا خاص میدان ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم وتربیت، سیاسی ومذہبی امور، قومی ووطنی عناصر کو بھی سرورؔ نے اپنی نظموں میں پیش کیا۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ کی زندگی کتنی اجیرن ہوتی ہے اس کی عکاسی ان کی نظم بیوہ میں ملتی ہے۔ حکم چند نیّرؔ نے لکھا ہے:

''سرور کا اجتماعی شعور اور سماجی احساس بالیدہ تھا۔''

(نوائے سرور: ص25)

ان کی مشہور نظم ''سوز بیوہ'' سے صرف دو شعر دیکھیے جن میں بیوہ کی تاریک زندگی پیش کی گئی ہے۔

پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری
اتاریں بدھیاں بیدرد! توڑیں چوڑیاں میری
وہ نقش نامرادی ہوں، سراپا درد ہوں غم ہوں
مرقع میں جہاں کے آہ! میں تصویر ماتم ہوں

سرورؔ کی ایک اور اہم نظم ''اجڑی ہوئی محفل'' ہے جس میں دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ ایک حزنیہ لہجہ اس پوری نظم پر حاوی ہے۔ ساتھ ہی اصلاح کا پیغام بھی ہے۔ آخر کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

یہ نتیجہ آہ ہو جس عیش کا پایان کار   تف ہے ایسے عشق پر اس سے تو بہتر ہے عذاب
دل لگانے کی جگہ دنیا نہیں ہے اے سرور   ساتھ دیتی ہے کسی کا آہ! کب خانہ خراب

اس کے علاوہ انھوں نے ہندو مذہب سے متعلق چند اہم نظمیں کہیں ۔ جیسے گنگا جمنی، لکشمی جی، پریاگ کا سنگم، سیتاجی کی گریہ وزاری وغیرہ۔ سرور نے حب الوطنی کے موضوع پر بھی کئی اچھی نظمیں پیش کیں ۔ یاد وطن، عروس حب وطن، پھولوں کا کنج، قومی نوحہ، مادر ہند وغیرہ۔

10.8.3 علامہ محمد اقبالؔ

اقبالؔ کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور سفر انگلستان سے پہلے یعنی 1905ء تک اور دوسرا دور وہاں سے واپسی کے بعد سے لے کر اواخر عمر تک ۔ اگر چاہیں تو مزید ادوار کی تقسیم ہوسکتی ہے لیکن ایسا ضروری نہیں ہے۔

شروع کی شاعری میں اقبالؔ کے یہاں قومی، وطنی اور مشترکہ تہذیب کے عناصر غالب ملتے ہیں۔ ساتھ ہی مناظر قدرت اور نیچرل شاعری کے نقوش پہلے دور کی شاعری میں خوب ملتے ہیں۔ ایسی نظموں میں ابر کہسار، ہمالہ، ماہ نو، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ خوب صورت منظر کشی کے لیے ''ماہ نو'' کا صرف ایک بند دیکھیے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب — نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب

چرخ نے بالی چرالی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

اقبالؔ نے دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفوں کو کھنگالنے کے بعد اسلام کی روح کو اصل قرار دیا۔ اسلامی افکار اور فلسفوں کو انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھا۔ تہذیبی اور اخلاقی تنزل کے لیے مغربی تہذیب کو موردالزام ٹھہرایا۔ ''ضرب کلیم'' کی ایک چھوٹی سی نظم مغربی تہذیب میں وہ کہتے ہیں ؎

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

ضمیرِ پاک خیالِ بلند و ذوقِ لطیف　　　رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

مشرقی تہذیب اورخودی کی پاسداری کا پیغام ان کی پوری شاعری کا مرکزی اور حاوی موضوع ہے۔ان کی نظم ''جاوید کے نام'' اور''ایک نوجوان کے نام'' سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں　　　سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے　　　خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

(جاوید کے نام)

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی　　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　　نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے مسلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں　　　کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

(ایک نوجوان کے نام)

اقبالؔ کی خوبی یہ ہے کہ وہ مسلم تہذیبی آثار اور عظمت رفتہ کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر جگہ عشق کا فلسفہ عقل پر حاوی نظر آتا ہے۔ مسجد قرطبہ، ہسپانیہ، اقوام مشرق، ذوق وشوق، ساقی نامہ جیسی نظموں میں ان کا فکری میلان واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھتے چلیں۔

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے　　　میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ　　　عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے　　　مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں　　　خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق	عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات	خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے	فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اردو نظم نگاری کو علامہ اقبال نے ایک وسیع تناظر سے آشنا کیا۔ انھوں نے آدم کی عظمت اور دین محمدی کے مرکزی افکار کو اپنی نظموں میں پیش کر کے اردو شاعری کے مرتبے کو بلند کیا۔ جو نظم آزاد اور حالی سے شروع ہوئی تھی اُسے اقبال نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

10.9 اہم نظم نگار شعرا (1936ء کے بعد)

1936ء کے آس پاس اردو نظم میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی۔ شاعروں نے محسوس کیا کہ سماجی سروکار کو اردو شاعری کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ سجاد ظہیر نے باضابطہ ترقی پسند تحریک شروع کی جس کی پہلی کل ہند کانفرنس اپریل 1936ء میں ہوئی۔ ادب کے افادی پہلو کو اہمیت دی گئی۔ بھوک، افلاس، طبقاتی کشمکش اور اجتماعی فکر کو موضوع سخن بنایا گیا۔ اسی ترقی پسند عہد میں اختر الایمان بھی تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے منشور سے باضابطہ وابستگی نہیں رکھی لیکن اردو نظم نگاری میں اونچا مقام حاصل کیا۔ اسی ترقی پسند تحریک سے کچھ شعرا اور ادبا الگ ہو گئے۔ اس جماعت کا نام ''حلقۂ ارباب ذوق'' رکھا گیا۔ اس کے مشہور شعرا میں ن۔م۔ راشد، میراجی، ضیا جالندھری، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا میں سے یہاں صرف راشد اور میراجی پر گفتگو ہوگی۔ اختر الایمان کو ترقی پسند شاعروں کے بعد رکھا گیا ہے۔

10.9.1 فیض احمد فیض

فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' شائع ہوا جس میں حسن و عشق کی دل فریبی، انتظار، محبوب سے قربت کی آرزو، محبوب کے خدوخال، زلف و رخسار کی باتیں، ہجر و وصال کا اظہار مساوی طور پر نظر آتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے ۔

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے   دست قدرت کو بے اثر کر دے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں   کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہوجاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے   ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہوجاؤں

لیکن ''نقش فریادی'' میں صرف یہی رنگ نہیں ملتا بلکہ انسانی درد اور ظلم و جبر کی کہانی بھی نظر آتی ہے۔ دیکھیے

جا بہ بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے

(مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ)

فیضؔ کی خوبی یہ ہے کہ اپنی شاعری کو انھوں نے نعرہ بازی سے بچائے رکھا ہے۔ ان کے یہاں جبر واستبداد کی پیش کش صرف ہندوستانی تناظر میں نہیں بلکہ ایران، بیروت اور فلسطین میں ہو رہے جبر وظلم کے تناظر میں بھی ہوئی ہے۔ پوری انسانی تہذیب کو پرخلوص جذبے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فلسطین بچے کی لوری، کیا کریں، عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا، ایرانی طلبا کے نام، رقیب سے، چند روز اور مری جان، کتے وغیرہ نظموں میں ان کی انسانی ہمدردی اور جذبۂ خلوص کو تخلیقیت اور فن کاری کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام ترقی پسند شعرا میں فیضؔ کا وقار اور مقام سب سے زیادہ مستحکم اور بلند ہے۔

10.9.2 مخدوم محی الدین

مخدوم کی نظموں میں رومانی عناصر بھی ہیں اور انقلابی امور کی کارفرمائی بھی۔ انقلاب کے اظہار میں کبھی کبھی

ان کے یہاں جذباتیت پائی جاتی ہے۔ سستی نعرے بازی نے کہیں کہیں ان کی شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' میں ''باغی'' نظم کے مطالعے سے یہی پتہ چلتا ہے۔ لیکن انھوں نے مندر و مسجد، کھیت، موسم، دہقانوں کی تان، کوئل کی کؤ کؤ، ماضی کے شکستہ نقوش کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ ان کے تہذیبی وفکری رویّے ہندوستانی رنگ سے ہم آمیز ہیں۔ بیشتر نظمیں دل چسپ اور دل کش ہیں۔ دو نظموں سے یہ ٹکڑے دیکھیے ۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج　　لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال　　خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
(نظم "حویلی": سرخ سویرا)

اُمّت مرحوم ہو یا ملت زنار دار　　ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار　　آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ بچوں کی پکار
(بنگال: سرخ سویرا)

10.9.3 اسرارالحق مجاؔز

مجاؔز کی شہرت بھی فیض سے کم نہیں رہی۔ ان کی شاعری میں رومانی اور انقلابی دونوں طرح کے عکس دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کا جذبۂ انقلاب بھی کبھی کبھی بے لگام ہو کر سطحی نعرہ بازی کے قریب آجاتا ہے۔ نظم ''انقلاب'' میں خون کا نقشہ جس طرح پیش کیا گیا ہے اس سے ان کا گھن گرن والا اسلوب سامنے آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز (1936ء) سے تین سال پہلے 1933ء میں یہ نظم کہی گئی تھی۔ نمونے کے طور پر دو شعر پیش کیے جارہے ہیں ۔

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے　　آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
ختم ہوجائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام　　رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

سرمایہ داری کے عنوان سے بھی ان کی ایک نظم ہے۔ اس میں لہجہ ذرا دھیما ہوا ہے اس لیے شاعری اچھی ہوگئی ہے۔ دو شعر دیکھیے ۔

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے　　مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے　　یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

مجازؔ کی جس نظم کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ''آوارہ'' ہے جو پندرہ بند پر مشتمل ہے۔ جذبات گرچہ یہاں بھی حاوی ہیں لیکن خلوص اور بے ساختگی نے اس میں روانی اور ہمدردی کے عناصر بھر دیے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے، میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

قصر تمدن اور تصنع بھرے سماج سے مجازؔ کو نفرت ہے۔ وہ عورت کو بھی انقلاب میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دیتے ہیں۔ نظم ''نوجوان خاتون سے'' کا یہ شعر دیکھیے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ان کی مشہور نظموں میں رات اور ریل، نذر خالدہ، نورا، آہنگ جنوں ہیں۔ فیضؔ نے ''آہنگ'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مجازؔ انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔

10.9.4 ساحرؔ لدھیانوی

ساحرؔ نے معاشرے کی کھوکھلی تہذیب اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے ان کی فکری لو تیز ہے لیکن اس سے جو روشنی نکلتی ہے وہ دلوں کو جلاتی نہیں بلکہ سلگن کی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ ان کی لفظیات فیضؔ سے بہت قریب ہے۔ ان کی نظم ''چکلے'' ہو یا ''پرچھائیاں''، ''اے شریف انسانو'' ہو یا ''شعاع فردا''، ''یہ کس کا لہو'' ہو یا ''تاج محل''، ''مرے عہد کے حسینو'' ہو یا ''آج'' ہر جگہ ان کا حزنیہ لہجہ اور فنکارانہ اظہار واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کوئی ترقی پسند

جنگ اور خون کو انقلاب کا ذریعہ تصور کرتا ہے کوئی آندھی اور طوفان کو۔ لیکن ساؔحر کو سنیے ۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

اندازہ ہوتا ہے کہ کتنا سچا فنکار ہے۔ وہ نہ خود کو دھوکا دیتا ہے نہ سماج کو جھوٹا سبز باغ دکھاتا ہے۔ ''چکلے'' کا صرف ایک بند دیکھیے جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کتنا سخت طنز کرتے ہیں لیکن کس خوب صورتی سے ۔

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی　　تنومند بیٹے بھی ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی　　ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

ظ۔ انصاری نے بہت مناسب تبصرہ کیا ہے کہ:

''ساؔحر کے یہاں شور پکار نہیں۔ احتجاج ہے، شان وشکوہ نہیں، ڈرامائی تناؤ ہے طمطراق نہیں۔ ہر ایک مظہر اور منظر اپنی اذیت یا مسرت کا اظہار ہے۔''

(بحوالہ فن اور شخصیت، ساحر نمبر، 1984ء، ص 55)

10.9.5 سلاؔم مچھلی شہری

سلاؔم ایک ایسے شاعر ہیں جو ترقی پسندوں میں گیت کے لیے بھی مشہور ہیں۔ کہیں عالم گیر مساوات کا ذکر ہے تو کہیں پیڑوں کے سائے میں رومان پرور کتھاؤں کا بیان۔ گیت سیّد مطلبی نے بھی لکھے ہیں اور سجاد ظہیر نے بھی۔ سلاؔم کے گیتوں میں کوئی توڑے نہ سپنوں کا ہار، کورس، میں باغ کی نازک تتلی ہوں، گیتوں کے ہروا گوندھوں گی وغیرہ اہم ہیں۔

سلاؔم کی نظر معاشرے کی کھوکھلی تہذیب پر بھی ہے۔ مزدوروں کی زندگی اور سماجی جبر کو بھی انھوں نے نظموں میں جگہ دی ہے۔ ساتھ ہی جذبۂ حب الوطنی کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان کی کچھ مشہور نظمیں اس طرح ہیں: خاموش رہو، سڑک بن رہی ہے، محدود سرخیاں، تاج محل، مسافر وغیرہ۔

10.9.6 سردارؔ جعفری

سردارؔ جعفری کا سیاسی اور سماجی شعور بالیدہ ہے۔ عورت کو ترقی پسندوں نے خاص طور پر موضوع بنایا اور اہم کردار کے طور پر پیش کیا۔ سلمٰی، عذرا، نورا اور پھر مریم اسی زمانے کے کردار ہیں۔ سردار کی مشہور نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں مریم اور جاوید کو کئی جہات سے مستحکم کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ سیاہی بھی ہے اور رزم بھی، محبت بھی ہے اور تصادم بھی۔ برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج بھی ہے۔ مریم کی زبانی صرف یہ ٹکڑا سنیئے جس میں وہ فرنگیوں سے مخاطب ہے:

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اٹھ گئی ہیں
تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں

سردارؔ کی نظمیں رومانی بھی ہیں اور انقلابی بھی، تہذیبی سروکار سے پر بھی ہیں اور سیاسی بصیرت سے معمور بھی۔ ''ایک خواب اور'' کی بیشتر نظمیں رومانی ہیں لیکن ''خون کی لکیر'' میں ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ''رومان سے انقلاب تک'' کا مطالعہ کریں تو کھوکھلی تہذیب سامنے آجاتی ہے:

میں نے دہلی میں پنجاب میں اپنے نغموں کی جھولی پساری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
اور انھوں نے مری گود میں / چند جھلسے ہوئے ہاتھ / ٹوٹی ہوئی ہڈیاں
خوں میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں

سردارؔ کی مشہور نظم ''جمہور'' بھی ہے جس میں ہندوستانی سماج اور سیاست کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور جو اقبالؔ کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' کی زمین میں ہے۔

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں — اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان — کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان

یہ گنگا کا آنچل یہ جمنا کا ریت　　　یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت

اخیر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سردار جعفری نے خیروشر کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔اسے حق وباطل بھی کہہ سکتے ہیں۔ان کی دوسری کئی مشہور نظمیں ہیں جیسے اودھ کی خاک حسیں، ہاتھوں کا ترانہ، ایشیا جاگ اٹھا وغیرہ۔

10.9.7 کیفی اعظمی

دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھی محکومیت ومظلومیت اور استحصال موضوعات کے طور پر آئے ہیں۔ظلم عورت پر ہو یا مزدور یا کسان پر، کیفی کا دل کانپ اٹھتا ہے۔عورت کو یہ بھی سماجی اور سیاسی تحریک میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔نظم عورت کا صرف ایک بند دیکھیے ؎

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں　　　تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دل چسپ کہانی ہی نہیں　　　تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

''بیوہ جو مطعون خلائق رہتی ہے اس پر ایک نظم ''بیوہ کی خودکشی'' ہے جس میں درد وکرب ہے۔کیفی کی ایک نظم ''لال جھنڈا'' ہے جس سے ان کی کمیونزم سے وابستگیٔ خاص کا اندازہ ہوجاتا ہے۔افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ بیشتر نظموں کی لَے بہت تیز بلکہ کرخت ہے۔فتح برلن یا یلغار یا پھر نئی جنت کا مطالعہ کریں تو یہی اندازہ ہوگا۔ان کی جو اچھی اور مشہور نظمیں ہیں ان کے نام یوں ہیں: دائرہ، زندگی، آوارہ سجدے، عورت، مکان وغیرہ۔

10.9.8 اختر الایمان

اختر الایمان کی نظمیں کسی بھی تحریک سے وابستہ نہیں۔البتہ ان کے یہاں ایک ایسا احساس ملتا ہے جو ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو محیط ہے۔لیکن ماضی ان کی شاعری کا ایک اٹوٹ حصہ ہے جو اپنی شکل بدل بدل کر آتا رہتا ہے۔ان کی نظم ''ایک لڑکا'' پڑھیں یا ''بازآمد'' یا پھر ''پرانی فصیل'' یا اسی طرح ''بنت لمحات'' یا ''عہد وفا''،

ہر جگہ وہی ماضی یا ماضی کی یادیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آ جاتی ہیں۔ لمحہ گذراں ہے جو حاوی رہتا ہے۔ ان کے حافظے میں جیسے ماضی نے بسیرا کرلیا ہو۔ ''بنت لمحات'' اور ''پرانی فصیل'' سے یہ ٹکڑے دیکھیے۔

حیات نام ہے یادوں کا تلخ اور شیریں　　بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے

شفق کو قید میں رکھا صبا کو قید کیا　　یہ ''لمحہ گریزاں'' ہے جیسے دشمن ہے

....

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے　　مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن

مرے سائے میں حال و ماضی رک کر سانس لیتے ہیں　　زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

ان کی پوری شاعری کے مطالعے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری کا مرکزی تصور ماضی اور اس کی یادیں ہیں۔

10.9.9 ن۔م راشدؔ

مجموعہ کلام ''ماورا'' 31 برس کی عمر میں 1941ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی مشہور نظم بقول کرشن چندر ''دریچے کے قریب'' ہے۔ ان کی نظموں میں اساطیری اور دیومالائی کردار اور نقوش ملتے ہیں۔ وہ انسانی دکھ درد میں بھی شریک ہوتے ہیں جس کی مثال میں انسان، لا = انسان دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح ''زندگی ایک پیرزن'' کے مطالعے سے بھی ان کے اندر ایک طرح کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔ نظم ''انسان'' کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں　　غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے

یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے　　ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں

بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے　　اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے

اس کے علاوہ ان کی نظموں میں صحرائی اور عجمی تہذیب کے نقوش بہت ملتے ہیں۔ نئی آگ، دل مرے صحرا نورد پیر دل، حسن کوزہ گر وغیرہ نظمیں ایسی ہی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں سماجی بدحالی، تہذیبی اقدار کا

نوحہ، جدید اذہان کی ٹوٹ پھوٹ کا عکس بھی ملتا ہے۔ان کے اسلوب شاعری میں ایک طنطنہ اور بے باکی اور نشاطِ کرب کا رنگ جھلکتا ہے۔اردو نظم کو انھوں نے ایک زندہ اور توانا اسلوب عطا کیا ہے۔

10.9.10 میرا جی

میرا جی کی شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت پراسرار اور پر کشش رہی ہے۔ان کی فکری جہات میں ہندوستانی تہذیب کے کئی دھارے شامل تھے۔ بدھ مت، وشنومت اور پھر ایشیائی رنگ۔ ان کی نظموں میں پرانی دیومالائی تصویریں ملتی ہیں۔ چونکہ مذہب اسلام میں تجسیمی احساسات کی گنجائش نہیں اس لیے انھوں نے ایک ایسے تصور کو اپنایا جہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔ان کا تصور ہے کہ روحانی حظ کے لیے بھی جسمانی وسائل ضروری ہیں۔اسی لیے ان کے یہاں تمام فکری دھارے محبوب یا عورت کے خارجی جسم یا لباس تک محدود ہیں۔عکس کی حرکت، نامحرم، ترغیب، دور کرو پیراہن کے بندھن کو جیسی نظمیں پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔میرا جی جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو ہمیشہ قدرت کی بڑی نعمت سمجھتے تھے۔سماجی بندھنوں کے وہ مخالف تھے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی نظموں کو ''دھرتی پوجا کی مثال'' کہا ہے۔نظم ترغیب سے یہ ٹکڑے:

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آرہی ہے
نگاہوں میں ہے میرے نشّے کی الجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا پیرہن آج ہر اک حسیں پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے
قوانین اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آرہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. ''نئی دنیا کو سلام'' کس کی مشہور نظم ہے؟

8. فیضؔ کے پہلے مجموعہ کلام کا نام کیا ہے؟

9. ابر کہسار، ماہ نو اور مسجد طرقبہ کس کی نظمیں ہیں؟

10.10 اُردو نظم 1960ء کے بعد

1955ء کے بعد اردو نظم نگاری میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی جس میں کلاسیکی یا روایتی ادا یا ترقی پسند تحریک کا موضوعاتی اصرار نہیں ملتا۔ یہ جدیدیت کا دور ہے۔ بندھا ٹکا نظریہ یا اجتماعی تحریک یا طے شدہ اسلوب اس نئی نظم کی شناخت نہیں۔ اس عہد نے نئے طرز ادا اور گدازانہ طور پر نئی نئی ہیئتوں کو جنم دیا۔ ترقی پسند تحریک کا سارا زور سماجی سروکار اور اجتماعی فکر پر تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق نے ہیئت اور اسلوب کی پابندی پر زور دیا۔

1960ء کے بعد کی نظموں میں رنگا رنگی اور تہہ داری ملتی ہے۔ پابند، معرا یا آزاد ہیئتوں کی قید یہاں نہیں رہ گئی۔ اس نئی نظم میں فن کاروں کو پوری آزادی ملی اور ہر لحاظ سے اردو نظم کو فروغ حاصل ہوا۔ نئے طرز احساس اور نئی حسیت نے نئی فضا بندی کی۔ چند اہم نظم نگار شاعروں کے نام اس طرح ہیں: منیب الرحمٰن، بلراج کومل، مغنی تبسم، شفیق فاطمہ شعری، عمیق حنفی، فہمیدہ ریاض، شہاب جعفری، زبیر رضوی، محمد علوی، شہریار، کمار پاشی، احمد ہمیش، ندا فاضلی، کشور ناہید، مظہر امام، کمار پاشی وغیرہ اس جدید نظم کے بارے میں مشہور ادیب و ناقد شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو ''جدید'' سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو۔''

(لفظ و معنی: فاروقی 1968ء، ص 126)

10.11 خلاصہ

اس سبق میں نظم کی تعریف اوراس کی چند خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی۔اب تک آپ کونظم کی صنفی پہچان ہوچکی ہوگی۔نظم میں ہیئت کے تجربے اوراس میں برتے جانے والے موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی۔جدید نظم کے آغاز یعنی ''انجمن پنجاب'' کے تحت محمد حسین آزاؔد نے جوتحریک شروع کی تھی اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔دراصل یہی آغاز ہے جس سے آئندہ چل کر اردو نظم کوئی آب وتاب نصیب ہوسکی۔

ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کوفروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔اس سبق میں کوشش کی گئی ہے کہ ہر دور کے اہم نظم نگار شاعروں پر اختصار کے ساتھ ہی سہی، کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی جائے۔بہت سے شعرارہ گئے ہیں کیوں کہ طوالت کی یہاں گنجائش نہیں تھی۔اسی طرح 1960ء کے بعد کی نظموں نے جس تبدیلی کا احساس دلایا وہ بھی توجہ طلب ہے۔آپ کو صرف اس عہد کی حسیت اور چند شاعروں کے نام سے واقف کرادیا گیا ہے تاکہ آپ انھیں اپنے مطالعے کی بنیاد بنا سکیں۔

10.12 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے 10-10 سطروں میں جواب دیجئے:

1. وزیرآغا نے میراجی کی نظموں کوکس نام سے یاد کیا ہے؟
2. علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجئے:

1. نظم کے آغاز اورارتقا پر روشنی ڈالیے۔
2. جدید نظم کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔
3. 1936ء کے بعد کی نظمیہ شاعری پر اظہار خیال کیجیے۔
4. فیضؔ اور سردارؔ جعفری کی نظم نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

10.13 فرہنگ

ممیّز	امتیاز والا' اونچے مقام والا	تناظر	پس منظر
ارتقائی عمل	آگے کی طرف بڑھنے کا عمل	پیادہ	پیدل
مرکزی خیال	اصل موضوع	سفال	مٹی
منشور	بکھرا ہوا' کسی جماعت کا Manifesto	عفیف	پاک

10.14 معاون کتابیں

1. اردو شاعری کا مزاج : وزیر آغا
2. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک : خلیل الرحمٰن اعظمی
3. نظم جدید کی کروٹیں : وزیر آغا
4. اُردو شاعری کا فنی ارتقا : ڈاکٹر فرمان فتح پوری
5. جدید اردو نظم اور یورپی اثرات : حامدی کاشمیری
6. تنقیدی افکار : شمس الرحمٰن فاروقی
7. پانچ جدید شاعر : حمید نسیم
8. اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے : عنوان چشتی
9. حآلی بحیثیت شاعر : شجاعت علی سندیلوی
10. حلقۂ ارباب ذوق : یونس جاوید
11. نئ نظم کا سفر : کتاب نما (خاص نمبر)
12. جدید اردو نظم: نظریہ و عمل : ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی
13. جدید نظم: حآلی سے میراجی تک : کوثر مظہری

(نوٹ: درج بالا کتابوں کا مطالعہ آپ دوسرے شعرا کے حوالے سے بھی کر سکتے ہیں۔)

10.15 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. نظم کی کوئی ایسی باضابطہ تعریف نہیں کی جاسکتی جس پر سب متفق ہوں، پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ایک ایسا منظوم فن پارہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو، تسلسل ہو، ربط ہو، ارتقا اور اختتام ہو، نظم ہے۔

2. شروع میں نظم مسدس، مثنوی، مخمس، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد وغیرہ ہیئتوں میں کہی جاتی رہی۔ بعد میں پابند ہیئتوں سے آگے بڑھ کر معرا، آزاد اور اب نثری ہیئتوں میں نظمیں کہی جارہی ہیں۔

3. نظم کے موضوع کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ سماجی مسائل سے لے کر حالات حاضرہ، تحریک آزادی سے لے کر عشق و محبت اور جدید حسیت جیسے موضوعات ہوسکتے ہیں۔

4. جدید نظم کے آغاز کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔

5. ''انجمن پنجاب'' کے تحت پہلا مشاعرہ 30 رمئی 1874ء کو ہوا۔

6. اس پہلے مشاعرے کا موضوع ''برسات'' تھا۔

7. ''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری کی نظم ہے۔

8. فیض کے پہلے مجموعہ کلام کا نام ''نقش فریادی'' ہے۔

9. ابر کہسار، ماہ نو اور مسجد قرطبہ علامہ اقبال کی نظمیں ہیں۔

اکائی 8 : اخترؔ شیرانی

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 سوانحی خاکہ

11.4 اخترؔ شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات

11.5 اخترؔ شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا''

11.5.1 نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کی شاعرانہ خصوصیات

11.5.2 پہلے بند کی تشریح۔(متن)

11.5.3 دوسرے بند کی تشریح۔(متن)

11.5.4 تیسرے بند کی تشریح۔(متن)

11.6 خلاصہ

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.8 فرہنگ

11.9 معاون کتابیں

11.10 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

11.1 اغراض ومقاصد

نظم نگاری ایک علیٰحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے 1874ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں سے وجود میں

آئی۔ نظم کو جو بات دوسری اصنافِ سخن سے ممتاز اور ممیّز کرتی ہے وہ اس کی وحدت' احساس تعمیر' خیال و تاثر اور ترتیب و اظہار کا انداز ہے۔ نظم ایک مکمل شعری وحدت ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تو محض ایک رنگ' ایک سُر یا ایک آواز ہے جو صرف اُسی وقت مزہ دے سکتی ہے جب دوسرے ان گنت رنگوں' سروں اور آوازوں کے ساتھ اسے ترتیب دیا جائے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے ایک ایسی صنفِ شاعری کی داغ بیل ڈالی جس میں ربط بیان اور خیال کی وحدت موجود ہو۔ تکنیک اور فنی تشکیل و تعمیر سے زیادہ نظم کے نفس مضمون میں وسعت اور واقفیت پیدا کرنے پر زور دیا جائے۔ حالیؔ نے شاعری کے دو بنیادی تصورات قائم کیے تھے۔ ایک اُس کا نیچرل ہونا اور دوسرے اس کی اخلاقی اہمیت۔ نیچرل شاعری میں زیادہ زور واقعات' افکار اور خیالات کے بیان میں جذبے کی گرمی اور احساس کی لطافت پیدا کرنے کی طرف دیا گیا۔

شبلی نے نظموں میں روانی' سادگی اور ترنّم کو بنیادی جوہر بنایا۔ چکبستؔ ، صفؔی' وحید الدین سلیم ، سرور جہان آبادی اور نظم طباطبائی نے نظم نگاری میں سنجیدگی' خیال انگیزی اور ترتیب و تسلسل کو قائم رکھا۔ آگے چل کر اقبالؔ نے نظم میں فلسفیانہ گہرائی و گیرائی پر زور دیا اور نفس مضمون اور تکنیک دونوں حیثیتوں سے انھوں نے نظم کو نئی شکل و صورت بخشی۔ یہ اردو نظم کا نیا سفر تھا جس میں اخترؔ شیرانی بھی شریک تھے۔

اس اکائی کے مطالعے سے آپ اخترؔ شیرانی کی حیات اور اُن کی شاعرانہ خصوصیات سے واقف ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ آپ اُن کی مقبول نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کا خصوصی مطالعہ بھی کریں گے۔

11.2 تمہید

اردو نظم کے نئے سفر میں نئی خیال انگیزی کے ساتھ نئے خیال کو جنم دینے والی صورتوں کا بھی التزام رکھا گیا۔ دعوتِ فکر دی گئی۔ اور اس طرح اردو شاعری اپنی ایک نئی صنف کو ساتھ لے کر کہ جس کا نام نظم تھا، اس طرح آگے بڑھتی رہی کہ ترقی کی کئی منزلوں کو اس نے حاصل کر لیا۔

اسی زمانے میں نوجوان شعرا رومانوی اثرات کے تحت نت نئے تجربے کر رہے تھے۔ یہ شعرا نظم کے اخلاقی و

اصلاحی لہجے سے اُکتا کر اس میں زیادہ شیریں اور سُبک جذبوں کی لے تلاش کرنے لگے۔ عورت ان کے نزدیک ''خلاصۂ کائنات'' تھی اور عشق ''اپنا معبود آپ پیدا کرنے'' کا ایک ایسا عمل تھا جو انسان کی جمالیاتی تربیت اور شعور و بصیرت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے اردو نظم کو سپردگی، مٹھاس اور سوز و گداز سے آشنا کیا۔ اس ضمن میں اختؔر شیرانی کی نظموں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں بڑی مٹھاس ہے، شخصیت کا سوز و گداز اور خلوص ہے۔ اختؔر شیرانی نے نظم کے فارم میں بھی تجربات کیے اور اپنے رومانی اور عشقیہ جذبات و احساسات کو نظم کرنے کے لیے اس صنف کا سہارا لیا۔

11.3 سوانحی خاکہ

اختؔر کے دادا مولوی اسماعیل خاں شیرانی، نواب وزیر الدولہ (1834ء سے 1865ء) کے زمانے میں ٹونک (راجستھان) میں آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو رہے۔ اختؔر کے والد حافظ محمود شیرانی ٹونک ہی میں پیدا ہوئے اور دنیائے اردو میں ایک بلند پایہ محقق اور ناقد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اختؔر شیرانی کی پیدائش 4/مئی 1905ء کو ٹونک میں ہوئی۔ ان کا تعلق سرحدی پٹھانوں کے قبیلے سے تھا۔ ان کے بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے اور راجستھان کے ضلع ناگور کے مقام ''بڑی کھاٹو'' میں بس گئے۔ اس کے بعد چھوٹی کھاٹو میں منتقل ہو گئے۔ جہاں اس قبیلے کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہو گئی اور قبیلہ کی نسبت سے اس کا نام ''شیرانیوں کی ڈھائی'' پڑ گیا۔ ان کے ایک بزرگ شیخ احمد کھٹو کا ذکر جہانگیر نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ اختؔر شیرانی کا سلسلۂ نسب افغانوں کے اسی مشہور خاندان ''خاندان شیرانی'' سے تھا جس کی مناسبت سے شیرانی کہے جانے لگے۔ گھر والوں نے ان کا نام محمد داؤد خاں رکھا تھا۔ مسعود خسرو اختؔر ان کا تاریخی نام تھا لیکن ادب کی دنیا میں اپنے تخلص اور خاندان کی نسبت سے اختؔر شیرانی کے نام سے متعارف ہوئے۔

اختؔر نے قرآن مجید، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم ٹونک کے مدرسوں اور مکتبوں میں حاصل کی۔ ان کے والد حافظ محمود خاں شیرانی 1914ء میں انگلستان سے واپس آئے تو اختؔر کی ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلیم و تربیت

کی طرف توجہ فرمائی اور ٹونک کے ایک مشہور پہلوان قیوم خاں کو ورزش کرانے اور کشتی سکھانے کے لیے مقرر کردیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خوش نویسی اور فنِ خطاطی کی تعلیم کا بھی باقاعدہ بندوبست کیا گیا۔ اس طرح اپنے والدِ محترم کے زیر سایہ اختر اپنی علمی، ادبی، ذہنی اور جسمانی تربیت پاتے رہے۔ 1921ء میں اختر اپنے والد کے پاس لاہور چلے گئے۔ یہاں ان کے والد نے اورینٹل کالج، لاہور میں داخل کرادیا۔ اس کالج میں اختر نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کے استاد بھی حیران رہ گئے۔ لاہور میں اختر نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی خصوصیت کے ساتھ پاس کیے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ اپنی ادبی سرگرمیوں، رومانی ولولوں اور جوانی کی سرمستیوں میں ایسے ڈوبے کہ آگے اور تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ بچپن ہی سے ان کی رومانی فطرت اور شعر گوئی کی طرف مائل طبیعت اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ ابتدا میں ٹونک میں انھوں نے صابر علی شاکر سے اصلاح لی۔ لاہور پہنچ کر کچھ دنوں علامہ تاجور نجیب آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ نوجوان اختر کی شعری صلاحیتوں کو لاہور کے ادبی حلقوں میں محسوس کیا جانے لگا۔ اور اسی کو محسوس کرتے ہوئے ''عالمگیر'' لاہور کے مدیر حافظ محمد عالم نے ان سے فرمائش کی کہ وہ منتخب تصاویر پر نظمیں لکھیں۔ اختر نے ان کی فرمائش پر ''جوگن''، ''تیتری'' اور ''حسن معصوم'' وغیرہ نظمیں کہیں۔ اور اس طرح اختر کی رومانی شاعری کا آفتاب بلند ہوتا گیا اور اُس زمانہ میں جبکہ انقلابی تحریک اور ادب میں رومانی تحریک کے خلاف علم بغاوت بلند تھا، اختر نے رومانی تحریک کی ایک نئی آب وتاب کے ساتھ علمبر داری کی۔

1943ء میں جب ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہوکر لاہور سے اپنے وطن ٹونک آئے تو اختر کو بھی ہمراہ ٹونک لے آئے۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ابھی باپ کا غم ہی کم نہیں ہوا تھا کہ اختر کے داماد محمد نظیر الدین بانا س ندی میں ڈوب گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں اختر اپنے اہل وعیال کو ٹونک میں ہی چھوڑ کر مرنے سے تقریباً چھ ماہ قبل لاہور چلے گئے۔ وہاں 9 ستمبر 1948ء کو زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اختر کا لاہور میں ہی انتقال ہوگیا۔ خدا نے انھیں سعادت مند اولاد عطا کی تھی جس نے

اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔ ان کے صاحبزادے مظہر محمود خاں نے تاریخ اور فارسی میں ایم ۔اے کیا جو شیخو پورہ پاکستان میں گورنمنٹ کالج میں لکچر رہوئے۔

اخترؔ کے شاگردوں میں ن۔م۔راشدؔ، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیبؔ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔اُن کی کل تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے۔جن میں شعری تصانیف میں پھولوں کے گیت (بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ) 1936ء، نغمۂ حرم نظمیں 1939ء، شعرستان 1941ء، اختر ستان 1946ء، طیور آوارہ، شہناز 1946ء، لالۂ طور 1947ء اور شہ رود بعد انتقال 1949ء ہیں۔

نثری تصانیف میں ترکی ڈرامہ ''ضحاک'' کا اردو ترجمہ 1930ء، آئینہ خانے میں 1934ء ترجمہ جوامع الحکایات، ترجمہ لوامع الروات مصنفہ محمد عوفیؔ مطبوعہ 1943ء وغیرہ ہیں۔آپ ماہنامہ ہمایوں 1922ء کے شریک مدیر، انتخاب، لاہور کے مدیر رہے۔خیالستان 1930 میں اور1935ء میں رومان، نام کا رسالہ نکالا۔

اخترؔ نے مکتوب نگاری میں بھی اپنے قلم کا کمال دکھایا۔رومانی نثر اور ادب لطیف کے نمونے پیش کئے۔اختر اور سلمی کے خطوط کے نام سے خادم حسین نے ان خطوط کو مرتب کر کے 1957ء میں شائع کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. اخترؔ شیرانی کہاں پیدا ہوئے تھے اور اُن کے والد کا کیا نام تھا؟
2. اخترؔ کے اہم شاگردوں کے نام بتائیے۔
3. اخترؔ کے بعض شعری مجموعوں کے نام بتائیے۔

11.4 اخترؔ شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات

اخترؔ شیرانی کو اردو کی رومانی شاعری میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ان کی شاعری میں رندی و سرمستی، سرشاری و کیف جوئی، لذت پرستی ونشاط اندوزی، حسن کاری و بہار آفرینی، رنگینی و رعنائی، منظرکشی وزیبائش اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہے۔موسیقیت، غنائیت اور نغمگی کا ایک خوشگوار دریا رواں دواں ہے۔اخترؔ کو

زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے جذبات واحساسات وتصورات کو بڑے دلکش اور جاندار پیکروں میں ڈھال کر منظر نگاری کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔ تشبیہات واستعارات کی منھ بولتی تصویریں ذہن وتصور کے سامنے رونما کردیں۔ ان کی شاعری میں جواں دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

اختؔر کی شاعری میں رومانیت کے تقریباً تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے گریز، زندگی کی تلخیوں سے فرار، یادِ ماضی، مستقبل کے حسین خواب، حسن اور حسن کی تلاش، بے انتہا تصوریت، جذباتیت، تخیلیت اور ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی تڑپ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔

محبت کے اقرار سے شرم کب تک　　کبھی سامنا ہو تو مجبور کردوں
نہیں زندگی کو وفا، ورنہ اختؔر　　محبت سے دنیا کو معمور کردوں

رومان مزاج کے شاعر کی آرزوئیں، تمنائیں اور خواہشیں اس قدر دشوار ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ یعنی اُسے اپنی امیدوں کے پورا نہ ہونے کا افسوس کرنا پڑتا ہے اور زندگی سراپا درد بن کر رہ جاتی ہے۔ اختؔر کے یہاں بھی غم، ہجر، تنہائی، درد اور کسک سے لبریز اشعار پائے جاتے ہیں۔

رہ گئے بن کے ہم سراپا غم　　یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

اسی غم کی بدولت اختؔر کے کلام میں سوز وگداز بھی پیدا ہوگیا۔ اس سوز وگداز کے سبب ہی ان کے کلام میں تغزّل رچ بس گیا ہے اور یہ تغزل ان کی غزلوں، نظموں، سانیٹ، گیت اور ماہیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تغزل سے بھرپور یہ اشعار دیکھئے۔

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا
تم نہ ہوتے نہ سہی ذکر تمہارا ہوتا
کس کو فرصت تھی زمانے کے ستم سہنے کی
گر نہ اُس شوخ کی آنکھوں کا اشارا ہوتا

اختؔر کے یہاں حسن پرستی کا وہ انداز پایا جاتا ہے جو عبادت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ حسن ان کی آنکھوں میں

بے پناہ نور اور دل میں بے انتہا سرور پیدا کرتا ہے اور عشق کی تڑپ ان کے تمام جذبات، احساسات اور خیالات کو تحریک دیتی ہے۔ وہ ہر لمحہ حسن کا دیدار چاہتے ہیں اور تلاشِ حسن میں سرگرداں رہتے ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری منزلِ لیلیٰ کی تلاش ہے۔ اور اس تلاش میں وہ مختلف وادیوں میں جانکلتے ہیں۔ ان کی نظموں میں گو کہ فکری عنصر بہت کم ہے لیکن جذباتی فراوانی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ فارم کے لحاظ سے اختر نے سانیٹ کو رواج دیا اور مستزاد سے بہت کام لیا۔ انھوں نے حُسن اور رومان کی تکمیل میں مختلف ذریعے سے، صوری آہنگ، موسیقی اور صوتی تلذّذ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ نظموں میں بندوں کی ترکیب و ترتیب کو بدلا ہے۔ قافیے کا نیا بندوبست کیا ہے۔ بحر کے ارکان کو دو مصرعوں میں تقسیم کر کے لکھا ہے۔ درمیانی قافیے کا استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے اختر نے انگریزی طرز میں سانیٹ بھی لکھے ہیں اور اسے مقبول بھی کیا ہے۔ سانیٹ میں مصرعوں کی تعداد معیّن ہوتی ہے لیکن قافیہ کی ترکیب کے کئی اسلوب ہیں۔ اس لحاظ سے سانیٹ اردو شاعری کی روایتی اصنافِ سخن کے مقابلہ میں آزادی پسند صنف ہے۔ اس کے علاوہ اختر نے پنجابی کی طرز پر اردو میں چند ماہیئے بھی تحریر کیے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. اختر شیرانی کس مزاج کے شاعر ہیں؟
5. اختر نے اُردو نظموں کے علاوہ اور کن اصناف پر طبع آزمائی کی ہے؟
6. اختر کا کوئی ایک رومانی شعر سنائیے۔
7. رندی و سرمستی، سرشاری و کیف جوئی، حسن کاری، بہار آفرینی اور رنگینی و رعنائی کس قسم کی شاعری کی خصوصیات ہیں؟

11.5 اختر شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا''

(ایک نو واردِ ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب)

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہے یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا کِس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن وہ سروانِ وطن، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
شاداب شگفتہ پھولوں سے معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں نو عمر خریدار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

11.5.1 نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کی شاعرانہ خصوصیات

اختر شیرانی کی مشہور نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' جذباتِ وطنیت کی مکمل ترجمان ہے۔ یہ حبّ وطن کی ایک شاہکار مثال ہے بلکہ یہ نظم اردو کے منظوم لٹریچر میں اپنا ایک خاص مقام اور وزن رکھتی ہے۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد اُس دور کی اردو دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور پنجاب کے ادبی وشعری حلقوں میں یہ نظم سب سے زیادہ بلندی کے مقام پر تھی۔ اس نظم کی رومانی فضا کو دیکھ کر تو بعض ناقدین نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اختر نے ''اس نظم میں تخیّل کی اُڑان سے صرف خیالی دنیا آباد کی ہے، حقائق وواقعات سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔'' لیکن یہ بھی مکمل

سچائی ہے کہ اختر نے اس نظم میں ٹونک کی وادیاں، اس کے باغ، اس کی رنگینیاں، اس کی بدلیاں اوراس کی پہاڑیاں و آبادیاں — غرض ان تمام حقیقتوں کواس کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اُس میں افسانوی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اختر نے خوداس نظم کواپنی نظموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہےاور ایک خط میں اعجاز سکندر نازش کو لکھتے ہیں:

''یہ بتانا کہ اپنی نظموں میں کون سب سے زیادہ عزیز ہے، بہت مشکل ہے — لیکن اگر مجھے یک بیک جواب دینے پر مجبور کیا جائے تو شاید''اودیس سے آنے والے بتا'' کا نام لوں۔ اس کی شانِ نُزول کیا ہے؟ صرف وہ تاثرات جوایک دیس سے آنے والے سے برسوں کے بعد مل کرکسی غریب الوطن کے دل پر مرتب ہوتے ہیں اور آنسو یا شعر بن کر جھلک پڑتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جہاں بچپن گزرا ہو اُس مقام کی یاد تو ہرایک کے گوشۂ دل میں چھپی رہتی ہے، لیکن جس شخص کواس مقام سے جُدا ہوئے پندرہ سال گزر چکے ہوں، اس کی تلخئ جذبات اور شدتِ احساس ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ میرا بھی ایسا ہی حال تھا۔''

(ماخوذ از مکاتیب نمبر''نقوش''لاہور)

اختر کی شاعری میں رومانی عنصر کی دو وجہتیں نمایاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک عالم کے گھر میں پیدا ہوئے تھےاور دوسرے ٹونک کی علمی وادبی فضااور وہاں کے ذرے ذرے میں مچلتا رومان۔ راہیؔ شہابی نے اپنے مضمون''اختر شیرانی کی شاعری کا دوسرا رُخ'' میں لکھا ہے:

''جب اختر کا عہد شباب تھا، ٹونک کا آفتاب اقبال عروج پر تھا۔ ٹونک آبادی کے لحاظ سے چھوٹا سا شہر یا بڑا قصبہ ہے۔ چاروں جانب سر بفلک پہاڑ، اوراُن پہاڑوں کے دامن میں بل کھاتی حسین وخوشنما بناس ندی ہے۔ آئے دن ساحلِ بناس پر میلے لگا کرتے ہیں۔ کھیل تماشے ہوا کرتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں اور گرمیوں

کی ٹھنڈی چاندنی راتوں میں تو ٹونک کی رنگینیاں پوری طرح جوان ہوجاتی ہیں۔
برسات میں ''نوگزے'' (مقام) ساحل پر جھومتے ہوئے بڑے درختوں کی شاخیں،
جھولوں کا نشیمن بن جاتی ہیں۔ جن پر — معصوم وحسین دوشیزائیں تیتریوں کی طرح
لہرالہرا کر برکھا کے رنگین ترانے الاپتی ہیں۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں
''ٹکراج'' اور ''گلوذ'' کے کنارے ندی کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر حسن وجمال اور
شباب ورعنائی کی جنت اُتر آتی ہے۔ کہیں ''چاربیت'' گائی جارہی ہیں تو کہیں شعرو
سخن کی محفل جمی ہوئی ہے۔ کہیں کچھ نازک اندموں کے نقرئی قہقہے فضاؤں میں
نغمگی پیدا کررہے ہیں — غرض وہاں عشق ومستی اور کیف ورنگینی کا ایک حشر بپا
رہتا ہے — اختر کا خمیر اسی خاک سے اٹھا تھا۔''

اختر شیرانی نے اپنی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں ٹونک شہر کی انھیں پُر بہار فضاؤں اور یادوں کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کم عمری میں ہی ٹونک سے شعر کہتے ہوئے لاہور گئے تھے، چنانچہ جاتے ہی لاہور کے رسالوں اخباروں میں آپ کی نظمیں شائع ہونے لگیں اور شہرت ومقبولیت حاصل ہوتی گئی — لیکن اختر شیرانی کو اپنے وطن ٹونک سے بے پناہ محبت تھی۔ جس کا مؤثر بیان ان کی تمام شاعری میں نظر آتا ہے۔ ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں انھوں نے وطن دوستی کے پاک جذبے کو جس سادہ اور سلیس انداز سے اپنی شاعری کے ہار میں پرودیا ہے وہ اردو شاعری کے لیے عظیم سرمایہ ہے۔ ماضی کی حسین یادیں اختر کا پیچھا نہیں چھوڑتیں، چاہے وہ میٹھی ہوں یا کڑوی، انسان کی زندگی میں رَس گھولتی رہتی ہیں۔ اختر شیرانی کا کلام بھی یادوں کا کلام کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں وہ وطن کی یاد میں ڈوب کر دیس سے آنے والے سے دیس کا حال چال دریافت کرتے ہیں۔ اُن کے ایک دوست اور ٹونک کے نامور شاعر صاحبزادہ حامد سعید خاں ساحلؔ جب ٹونک سے لاہور گئے اور اختر سے ملے تو اُن سے مخاطب ہوکر اختر نے یہ نظم لکھی۔ چنانچہ اس نظم کے پس منظر میں ہم ٹونک کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور رومانی زندگی کو بخوبی دیکھ

سکتے ہیں جس میں اپنے پرائے ، ندی ، نالے، پہاڑ ، دھوپ چھاؤں، چاند سورج ، جھولے ، پیڑ پودے ، پنگھٹ ، پنہاریاں، چوپال، بازار، در و بام، گلیاں، کوچے، دوست، محبوبائیں، دوشیزائیں—— سبھی کو اختر شیرانی نے اس نظم میں یاد کیا ہے۔ اور اُن کا حال چال پوچھا ہے۔ ہر غریب الوطن کے دل میں احساس اور زبان پر یہی کلمہ رہتا ہے کہ ''ہم تو ہیں پردیس میں اور دیس میں نکلا ہوگا چاند'' اور چاند پر نظر پڑتی ہے تو یادیں اُبھر آتی ہیں۔ مسلسل یادیں، دیس بدیس کی یادیں۔ آدمی کے دل کی گہرائی میں اُترتی بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھتے ہوئے دنوں کی یادیں—— اپنا شہر، اپنے لوگ، اپنی زمیں اپنا آسماں—— اپنا کلچر، اپنی تہذیب، اپنے سکھ اپنے دکھ کچھ کھٹے میٹھے یہ سب وطن سے دور رہنے والے کو اتنی شدت سے ستاتے ہیں کہ مانو وہ جس جگہ رہ رہا ہے وہاں کوئی رونق ہی نہ ہو—— تمام رونقیں، تمام یادیں بس اُسی وطن تک سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ گویا جسم پردیس میں اور روح دیس میں ہی رہ جاتی ہے۔ اختر شیرانی نے انھیں جذبات کی ترجمانی نہایت موثر انداز میں اس نظم میں کی ہے جس کی سلاست، روانی، سادگی، صداقت اور دل میں گھر کر جانے والا اندازِ بیان بے شک اس نظم کو اردو نظم نگاری کی دنیا میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

11.5.2 پہلے بند کی تشریح

یہ نظم جس کا عنوان ''او دیس سے آنے والے بتا'' ہے اختر شیرانی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ جس میں ایک شخص جو اپنے وطن سے دور پردیس میں جا کر آباد ہو جاتا ہے۔ مدتیں گزر جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اُس کے دل میں یادیں ہی یادیں آباد ہو کر اسے ایک طرح سے بے چین کرتی رہتی ہیں، مگر وہ مجبور ہے لاچار ہے۔ زندگی کی انھیں مجبوریوں میں گھرا ہوا ایک شخص جب اپنے وطن کے کسی دوست کو اپنے سامنے پاتا ہے تو جذباتِ وطنیت یادوں کی برسات لے کر کچھ اس طرح اُمڈ کر برستی ہے کہ اشعار کی جھڑی لگ جاتی ہے یا آنسوؤں کی۔ یہاں چونکہ اختر شیرانی ایک بے حد حساس طبیعت کے شاعر تھے اور ان کے وطن ٹونک شہر کے متعلق اُن سے حال چال دریافت کرتے ہیں بس اس بند میں انھیں جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پہلے بند کے پہلے مصرعہ میں شاعر بے ساختہ ہو کر اپنے دوست سے پوچھ رہا ہے کہ—— اے میرے دوست

بتا — دوست احباب کیسے ہیں، کس حال میں ہیں؟ میں ایک آوارۂ غربت، جو اپنے وطن سے دور آ گیا ہے — مجھے سناؤ کہ اُس وطن کے لوگ کہ جہاں حضرت یوسفؑ جیسے خوبصورت نوجوان جنم لیتے ہیں وہ کس رنگ میں ہیں، یعنی خوش و خرم تو ہیں یا نہیں؟ وہ باغ کی طرح کھلتا، پھلتا، پھولتا سرسبز و شاداب وطن ٹونک، جو میرے لئے جنت کی مانند ہے — کیسا ہے؟ سب دوست احباب، عزیز و اقارب، ادباء و فضلاء جو سرو کے درخت کی مانند ہمیشہ اونچائیوں کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں ہمیشہ منفرد رہتے ہیں — وہ سب کیسے ہیں؟ وہ میرے ریحانِ وطن یعنی خوشبودار درختوں کی مانند اپنے علم اور انسانیت کی مہک لٹانے والے میرے اہلِ وطن — کیسے ہیں، کس حال میں ہیں؟ خدارا مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ اختر نے یہاں ''بتا'' میں ایسی شتابی کا پہلو پوشیدہ رکھ دیا ہے کہ جس میں بے تکلفی اور بے ساختگی کی وہی شان پیدا ہوگئی ہے جو ایک بے تکلف دوست سے ملنے پر ہوا کرتی ہے۔

پھر یہ کہ ایک شخص اپنے وطن سے دور رہ کر کس طرح اپنے لوگوں کی خیریت، اپنے وطن، اپنے شہر کے حالات جاننے کو بے قرار رہتا ہے، بے چین رہتا ہے — اور پھر کوئی ہم وطن مل جائے تو وہ کس کس طرح کے اس سے سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے، مخاطب ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کو اختر شیرانی نے ان مصرعوں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں کنعانِ وطن، سروانِ وطن اور ریحانِ وطن استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان استعارات نے شعر کی دلکشی اور تاثر میں اضافہ کر دیا ہے اور شعر میں تہہ داری و معنی میں وُسعت پیدا کر دی ہے۔ کنعان، ریحان اور سرو کی جو خوبیاں ہیں وہ سب اہلِ وطن میں شاعر محسوس کر رہا ہے، دیکھ رہا ہے، بلکہ مان کر چل رہا ہے کہ اُس کے وطن کے لوگ ایسے ہی ہیں — اپنے ہم وطنوں کو اتنی محبت، خلوص اور احترام کے ساتھ، اتنے بہتر طریقے سے یاد کرنا اور پھر اس حقیقت کو نظم میں ڈھالنا — اختر شیرانی کا بہترین کارنامہ ہے۔

11.5.3 دوسرے بند کی تشریح

دوسرے بند میں اختر شیرانی دریافت کرتے ہیں کہ — ''اے دوست بتاؤ، کیا اب بھی یعنی پہلے کی طرح وہاں سرسبز و شاداب باغوں میں جھوم جھوم کر مستانہ ہوائیں چلتی ہیں، جو دلوں میں سرُور، امنگ اور تاثیر پیدا کر دیتی

ہیں۔ شگفتگی کا احساس کرادیتی ہیں؟ کیا اب بھی وہاں کے پہاڑوں پر گھنگور گھٹاؤں کا نشیمن ہے۔ اب بھی وہاں برسات کی جھڑی ویسی ہی لگتی ہے، اُسی طرح موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور وہ بارش وہاں کے لوگوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے۔۔۔ بتا اے دوست جلدی بتا!

ٹونک میں نوابوں کے وقت میں لگائے گئے بہت سے باغات تھے، جن میں ملک اور ملک کے باہر سے بیج اور نایاب پودے اور پھول منگوا کر لگوائے گئے تھے۔ اختر شیرانی کا انھیں باغوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ٹونک میں دو اونچی پہاڑیاں بہت مشہور ہیں ایک ''رَسیا کی چھتری'' اور دوسری ''اَن پورنا'' کہلاتی ہے۔ پربت کا ذکر اسی ضمن میں ہوا۔۔۔ اختر شیرانی نے مستانہ ہواؤں، گھنگور گھٹاؤں اور برکھا کا دلوں کو لبھانے کا ذکر اس خوبصورتی، سلاست، روانی، دلکشی اور بے قراری سے کیا ہے کہ نظم میں رومانیت کا عنصر غالب آ گیا ہے۔ اور یہی رومانیت اختر کی شاعری کی پہچان بھی ہے۔ ہوا کے مستانہ ہونے کا تصور، گھٹا کا گھنگور ہونا اور برکھا کا دلوں کو لبھانا، ایسے اشارے ہیں جو لطافت پیدا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اختر شیرانی نے اپنی یادوں میں بسے اپنے وطن کے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی نہایت سلیقے اور کامیابی سے کی ہے۔ اور دوست کو اس طرح مخاطب کیا ہے کہ ہر پڑھنے سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ واقعی پردیس میں اپنے دیس کی یادیں اسی طرح دیوانہ کر دیتی ہیں۔

11.5.4 تیسرے بند کی تشریح

ابتدا سے ہی ٹونک کی فضا میں خوشبو کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ وہاں باغ بہت تھے، جن میں موگرا، چنبیلی، چمپا اور گلاب کے پودوں اور مورسلی وغیرہ کے درختوں کی بھرمار تھی۔ اور ان پھولوں کے گندھے ہار لے کر مالنیں جب بازار میں لے کر آتیں تو بازار مہک اٹھتا تھا۔ اور خریدار ٹوٹ پڑتے تھے۔ ایک معمولی رکشا چلانے والا تک گرمیوں کی شام کو جب کوئی غزل گنگناتا ہوا، گلے اور کلائی میں موگرے کے پھولوں کے ہار ڈالے ہوئے مدمست ہو کر رکشا چلاتا تھا تو، اُس میں بیٹھنے والے گراہک کو بھی اُس کی جمالیاتی حسن پر رشک آنے لگتا تھا۔ پانچ چھ سال قبل تک ایک روپے کے پانچ ہار ملتے تھے، وہ سب باقاعدہ پکّے دھاگے میں گُتھے ہوتے۔ بے حد اہتمام سے پروئے ہوئے یہ ہار آج بھی

ایک روپے کا ایک دستیاب ہے۔ ان کا چلن اب بھی ویسا ہی ہے جیسا اختر شیرانی کے زمانے میں تھا۔ شام کو اکثر مرد اپنے گھر جاتے وقت انھیں خرید کر لے جاتے ہیں۔

اختر شیرانی نے اس بند میں انھیں تمام رواجوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور وہ اپنے ہم وطن سے پوچھ رہے ہیں کہ مجھے بتا اے دوست — کہ کیا اب بھی باغوں میں مہکتے تر و تازہ پھولوں کی بہار ہے، کیا اب بھی مالنیں بازار میں ہار پرو کر لاتی ہیں؟ کیا اب بھی اُن کے خریدار اتنی ہی تعداد میں ہوتے ہیں، جتنی کہ میں نے دیکھا تھا یا ہم تم دیکھا کرتے تھے؟ — ٹوٹ پڑنا، محاورہ کو اختر نے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں کس علاقے کی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے؟
9. نظم میں شاعر کس جذبے سے سرشار ہے؟
10. نظم کے آخری بند میں 'ٹوٹے پڑنا' سے کیا مراد ہے؟

11.6 خلاصہ

غرض یہ کہ اختر شیرانی نے اپنے وطن کی ایک ایک یاد کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ اور اس خوبصورت نظم کا حصہ بنایا ہے۔ حقیقت کو اس طرح خیال کی ہم آہنگی سے ایسے بیان کرنا کہ حقیقت ایک جادوئی دنیا کا احساس کرا دے یا پھر واقعات کو اس طرح افسانوی رنگ میں ڈھال دینا کہ اُس میں رومان پیدا ہو جائے بلا شبہ اختر کا کارنامہ ہے۔ اور یہی وہ رومان ہے جس کی وجہ سے اختر شیرانی اردو ادب میں اپنی علیحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ حسن اور رومان کی تکمیل میں صوری آہنگ، موسیقی، صوتی تلذذ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن پرستی کا انداز ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ حالانکہ اختر کا دعویٰ تھا کہ ان کی شاعری تصوف سے پاک ہے، اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ان کا عشق ایک ماورائی کیفیت لئے ہوئے تھا۔ ان کی شاعری میں ہوس اور شہوانی جذبے کی پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن ان کی فطرت کا کوئی جوہر ایسا تھا جو ان چیزوں کو بھی پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ انھوں نے آزادی کے ترانے بھی

گائے، اور وطن دوستی کے بھی۔ آزادی پر وہ اپنا عشق تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور وطن پرستی کا جذبہ جب جوش دکھاتا ہے تو وہ ساقی کو بھی تلوار اٹھانے کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی وطنی نظموں میں اس مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نمایاں طور پر موجود ہے، جس مٹی میں ان کا جنم ہوا، پرورش ہوئی، لڑکپن کھیلا، عہد شباب میں قدم رکھا، بس یہی ارضیت ان کی نظموں کی جان ہے۔

اودیس سے آنے والے بتا' کے علاوہ نذرِ وطن' وادیٔ گنگا میں ایک رات' اے عشق کہیں لے چل' سلمیٰ' عذرا' جہاں ریحانہ رہتی ہے'، ایک شاعرہ کی شادی پر' اے سرزمینِ گجرات' سرزمین عشق' عورت فنونِ لطیفہ کی دنیا میں' ساقی اٹھ تلوار اٹھا' گلبانگِ قفس وغیرہ مشہور ہیں۔

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. اختر شیرانی کا مختصر سوانحی خاکہ لکھیے۔
2. اختر شیرانی کے رومانی انداز کی ترجمانی کیجیے۔
3. اختر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں ٹونک کی کن کن فضاؤں کا ذکر آیا ہے؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. اختر شیرانی کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. اختر شیرانی کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبے کی نشاندہی کیجیے۔
3. نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتائیے کہ اردو شاعری میں اس کا مقام اہمیت کا درجہ کیوں رکھتا ہے؟

11.8 فرہنگ

آماجگاہ وہ جگہ جہاں نشانہ رکھیں اور کبھی مراد اس سے شاہ نشین بھی ہوا ہے۔

ادراک	عقل، پانا، دریافت کرنا
ملّی	زمانۂ دراز
استدلال	دلیل دلانا، دلیل طلب کرنا
تخیل	کسی چیز کا خیال میں لانا
اہل وعیال	گھر کے لوگ (بیوی بچے وغیرہ)
تغزل	غزل کہنا، غزل کا آہنگ
نزول	نازل ہونا، اترنا
ادبا	بہت سے ادیب، ادیب کی جمع
فضلا	فاضل کی جمع، علماء
منفرد	تنہا، اکیلا، واحد
وسعت	پھیلاؤ، کشادگی
ارضیت	زمین سے متعلق، زمین

11.9 معاون کتابیں

1. اردو میں رومانوی تحریک : محمد حسن

2. جدید اردو ادب : محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1975ء

3. کلیاتِ اختر شیرانی : گوپال متّل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1997ء

11.10 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اختر شیرانی ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے تھے اور اُن کے والد کا نام حافظ محمود شیرانی تھا۔

2. اختر کے اہم شاگردوں میں ن۔م راشد، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب وغیرہ شامل ہیں۔

3. پھولوں کے گیت' شعرستان' اخترستان' طیور آوارہ' لالۂ طور

4. اختر شیرانی رومانی شاعر ہیں۔

5. سانیٹ اور ماہیے

6. کچھ تو تنہائی کی راتوں کا سہارا ہوتا   تم نہ ہوتے نہ سہی ذکر تمہارا ہوتا

7. رومانی شاعری کی

8. ٹونک راجستھان کی

9. حب الوطنی

10. ٹوٹے پڑنا کے معنی ہجوم ہونا' کافی بھیڑ ہونا ہے جبکہ آخری بند میں اس سے مراد بہت زیادہ خریدار ہونا ہے۔

اکائی 9 : اسرارالحق مجآز۔ ''آوارہ''

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

12.3 اسرارالحق مجآز:حیات

12.4 مجآز کی شاعری

12.5 مجآز کی نظم ''آوارہ'' کا متن

12.5.1 نظم آوارہ کی تشریح

12.5.2 نظم آوارہ کا مجموعی تاثر

12.6 خلاصہ

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.8 فرہنگ

12.9 معاون کتابیں

12.10 اپنے مطالعے کی جانچ:جوابات

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو ترقی پسند شاعر مجآز کے حالات زندگی اور شاعری سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ مجآز کے حالات زندگی سے واقف ہوسکیں گے اور نظم ''آوارہ'' کے مرکزی خیال سے واقفیت حاصل کریں گے اوراس کی تشریح بھی کرسکیں گے۔

12.2 تمہید

ترقی پسند شعرا میں مجازؔ اپنی ایک خاص شناخت رکھتے ہیں۔ وہ فطرتاً انقلابی ہیں۔ ان کی شاعری میں خیال عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ جذبے' فکر' احساس اور شعور کی ہم آہنگی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ نظم ''آوارہ'' اس کی اچھی مثال ہے۔ اس اکائی میں ہم مجازؔ کے حالات زندگی اور شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی انقلابی نظم ''آوارہ'' کا مطالعہ کریں گے۔

12.3 اسرار الحق مجازؔ: حیات

اسرار الحق مجازؔ لکھنوی 19/ اکتوبر 1911ء کو بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری سراج الحق تھا' جو لکھنؤ میں محکمہ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے۔ دادا کا نام چودھری احمد حسین تھا جو متوسط درجہ کے زمین دار تھے۔ ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کی رفیقۂ حیات مجازؔ کی ہمشیرہ تھیں۔ روایتی تعلیم کے بعد مجازؔ نے امین آباد اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ 1929ء میں سینٹ جانس کالج، آگرہ میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ آگرہ کا ماحول ان کی شعری وادبی زندگی کے لیے سازگار تھا۔ فانیؔ بدایونی ان کے پڑوسی تھے۔ کالج کے ساتھیوں میں معین احسن جذبی ان کے خاص دوست تھے۔ آل احمد سرورؔ بھی اس زمانے میں اسی کالج میں زیر تعلیم تھے اور مجازؔ اور جذبیؔ سے ایک سال سینئر تھے۔ آگرہ میں میکشؔ اکبر آبادی سے بھی مجازؔ کے دوستانہ مراسم تھے جس کی وجہ سے مجازؔ کے روابط فانیؔ بدایونی سے قائم ہوئے اور مجازؔ نے ان سے اپنی کچھ غزلوں پر اصلاح بھی لی۔ حامد حسین قادری نے آگرہ میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی۔ اس ادبی ماحول نے مجازؔ کو متاثر کیا اور ان کی فکر کو اجاگر کرنے' ان کی صلاحیتوں کو چمکانے اور ان کے اچھوتے جذبات کے اظہار کے لیے مواقع فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

1930ء میں مجازؔ کے گھر والے آگرہ سے علی گڑھ آ گئے اور 1931ء میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ دسمبر 1933ء میں انجمن حدیقۃ الشعرا کے سالانہ مشاعرے میں جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کی تھی جس میں حسرتؔ موہانی' اصغرؔ گونڈوی اور حفیظؔ جالندھری نے شرکت کی تھی۔

مجاؔز نے ''صبح بہار'' کے موضوع پر ایک پُر اثر و پُر سوز نظم سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ علی گڑھ کی خوشگوار ادبی فضا سے مجاؔز کا یہ پہلا تعارف تھا۔ 1935ء میں مجاؔز نے بی۔ اے کی ڈگری لی اور ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لیا۔ شاعر کی حیثیت سے وہ اس قدر مقبول تھے کہ پرانی روایتوں کو نظر انداز کر کے انہیں سال اول کے طالب علم ہونے کے باوجود میگزین کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ وہ مسلم یونیورسٹی میں تقریباً پانچ سال تک رہے۔ ان کی زندگی کے یہی پانچ سال ان کے ذہنی سکون کے ہیں۔ انہیں یہاں مسرت افزا ماحول، پُر کشش فضا اور زندگی کی رعنائیوں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا۔ علی گڑھ کے پانچ سال ان کی زندگی میں ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ یہاں انہوں نے ترقی پسند تحریک سے خود کو وابستہ کیا۔ انقلاب کے نعرے لگائے اور خوش حال زندگی کے خواب دیکھے۔ 1935ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے وابستہ ہوئے لیکن وہ یہاں ایک سال سے زیادہ ملازمت نہ کر سکے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو کے رسالے ''آواز'' کے سب۔ ایڈیٹر بھی تھے۔ ریڈیو کی ملازمت ترک کرنے کے کچھ دن بعد مجاؔز دہلی میں رہے۔ کچھ وقت دوسرے شہروں میں بھی گزارا پھر انہوں نے اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں لکھنؤ ترقی پسند تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا۔ یہاں ترقی پسند ادیبوں کے ترجمان ''پرچم'' کے معاونین میں شامل ہو گئے جس کے نگران سبط حسن تھے۔ جذبی اور مجاؔز معاونین تھے۔ 1935ء میں سبط حسن، علی سردار جعفری اور مجاؔز نے ''نیا ادب'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالا۔ 1940ء میں مجاؔز پر جنون کا پہلا دورہ پڑا اور 1952ء میں تیسرا دورہ پڑا۔ انہیں رانچی مینٹل ہاسپٹل میں شریک کروایا گیا وہاں تقریباً چھ ماہ رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد گھر لوٹے تو ان کی بہن صفیہ اختر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس صدمے کے بعد مجاؔز نے شراب چھوڑ دی اور صفیہ اختر کے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ ان کے احباب نے انہیں شراب پینے پر مجبور کر دیا۔ 5 دسمبر 1955ء کو بلرام پور اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔ نشاط گنج، لکھنؤ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. مجاؔز کا پورا نام کیا تھا؟

2. مجازؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

3. مجازؔ کے بعض ہم عصر شعرا کے نام بتائیے۔

4. ''صبح بہار'' کس کی نظم ہے؟

5. مجازؔ کن کن شہروں میں مقیم رہے؟

12.4 مجازؔ کی شاعری

مجازؔ نے اپنی شاعری کا آغاز ایک ایسے زمانے میں کیا جب ہندوستان نئی روشنی کی تلاش میں سرگرم عمل تھا۔ آزادؔ اور حالیؔ کی حقیقت نگاری کی تحریک نے مجازؔ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے مختلف رنگ بدلے تھے۔ کہیں اس نے مشرق روایات پرستی اور حب الوطنی کا روپ اختیار کیا تو کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و جبر کے ردعمل میں انقلاب کی نقیب بن گئی۔ مجازؔ کا دور صنعتی انقلاب کا دور تھا۔ پرانے جاگیردارانہ نظام کی جگہ نئے سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی تھی جس کا اثر سماجی اور تہذیبی زندگی پر پڑ رہا تھا۔ نوجوان طبقے میں ناآسودگیوں' معاشی مسائل اور سیاسی بحران کی وجہ سے ایک بیزاری کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ دوسری طرف آزادی کا خوش آیند تصور اور نئی زندگی کا حسین خواب ہر نوجوان کو دعوت عمل دے رہا تھا لیکن جلد ہی وہ دور بھی آ گیا جب خواب ٹوٹنے لگے' بے روزگاری اور بے اطمینانی بڑھنے لگی۔ اس شدید بے چینی کے دور میں نئی نسل کی نفرت اپنے عروج پر تھی۔ مجازؔ کی شاعری میں اپنے دور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں جن میں معاشی' معاشرتی' سیاسی اور تہذیبی محرکات اور اس دور کی ذہنی حالت کے بتدریج ارتقا کا شعور ملتا ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری کو انقلاب کا صحت مند موڑ دیا ہے ان کے انقلابی رنگ میں جمالیاتی شعور بھی ہے۔ مجازؔ نے اپنی شاعری میں عورت کو اسی دنیا کے آب و گل کی عورت کی شکل میں پیش کیا ہے اور اسے اس کارزارِ ہستی میں مردوں کے دوش بدوش دعوت عمل دیتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اسے انقلاب میں حصہ لینے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اُردو شاعری میں یہ تصور بالکل نیا تھا اور اس تحریک آزادی کی دین تھا جس نے جھانسی کی رانی' بیگم حضرت محل وغیرہ سے لے کر سروجنی نائیڈو جیسی بے شمار ہندوستانی خواتین کو جنم دیا تھا۔

مجاؔز کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانوی انداز سے کی جس میں خالص غنائی' جذباتی اور نشاطیہ رنگ غالب ہے لیکن ان کے یہاں زندگی کی حقیقتوں کا بھی شدید احساس ہے اس لیے رومان اور حقیقت کی ہم آہنگی ان کی نظموں میں ایک نئی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ انہوں نے محبت کے نغمے بھی گائے ہیں اور ساتھ ہی انقلاب کا ساز بھی چھیڑا ہے۔ وہ گہرا تاریخی اور سماجی شعور رکھتے تھے ان کے یہاں اجتماعی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل کی ترجمانی کا رجحان بھی اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

6. مجاؔز کی شاعرانہ خصوصیات کیا ہیں؟
7. مجاؔز کی شاعری میں عورتوں کو کیا مقام حاصل ہے؟
8. کیا یہ درست ہے کہ مجاؔز گہرا تاریخی اور سماجی شعور رکھتے تھے؟

12.5 مجاؔز کی نظم ''آوارہ'' کا متن

1. شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

2. جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

3. یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

4. پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

5. رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانہ میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

6. ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

7. راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

8. منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا تیرے لیے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

9. جی میں آتا ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پاسکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

10. اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

11. دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

12. جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا میں سارے کے سارے نوچ لوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

13. مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

14. لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے چمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

15. بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

12.5.1 نظم آوارہ کی تشریح

''آوارہ'' اُردو شاعری کی شاہکار نظم ہے۔ مجازؔ نے پہلی بار لفظ ''آوارہ'' کو اس کے عام مفہوم سے ہٹ کر ایک سرکش اور باغی کے معنوں میں استعمال کیا۔ یہ نظم انقلاب اور رومان کا حسین امتزاج ہے اور اپنے دور کے ہر اس نوجوان کے ذہن کی آئینہ دار ہے جو نظام پارینہ کی ستم کاریوں کو مٹا کر نئے نظام کے خواب دیکھ رہا ہے۔

(1 تا 4 بند) اس نظم میں شاعر کی ذہنی کشمکش اور نفسیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں ٹھوکر کھایا ہوا نوجوان شاعر کس درجہ ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ یہ نوجوان (شاعر) جب اپنے محسوسات کی دنیا میں اتنے سارے کرب، اتنی ساری ناکامیوں ومحرومیوں کے ساتھ شہر کی جیتی جاگتی سڑکوں پر عالم وحشت میں نکل پڑتا ہے تو

اس کی نظر متضاد اور مختلف تصویریں دیکھتی ہے۔ وہ حالات کے ہاتھوں تنگ ہوتا ہے۔ نظام کہنہ اور آئین فرسودہ اس کی فطری آزادی کو سلب کر کے اس کی انا کو تازیانے لگاتے ہیں تو اپنا خود کا شہر اور اس کی شاہراہیں جن پر دربدر آوارہ پھرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے' غیر کی بستی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ تمام خوش آیند خوابوں کے تانے بانے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کی سینہ فگاری جھلملاتے قمقموں کے درمیان زنجیر دِکھتی ہے۔ اس کے قلب وجگر کے زخم اندھیری رات میں اسے دن کی روشنی سے لطف اندوز ہونے نہیں دیتے۔ آسمان پر تاروں کا بچھا ہوا جال اور ان کی روپہلی چھاؤں اسے صوفی کا تصور یا عاشق کا خیال معلوم ہوتی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر اسے یہ خیال آتا ہے کہ اس کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا اور دل میں غم کے جو دریا موجزن ہیں ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ مضطرب ہو کر کہہ اٹھتا ہے:

اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

(5 تا 8 بند) رات رنگین ہے اور اس کی رنگینی ہنس ہنس کر اسے میخانے کی طرف جانے کی ترغیب دیتی ہے۔ لیکن نوجوان (شاعر) کی امنگیں حرماں نصیبی اور غم واندوہ کا شکار ہیں۔ تمام عیش وعشرت سے وہ محروم ہے اور اس کا احساس اسے چوٹ پر چوٹ پہنچاتا ہے۔ اب اس حرماں نصیب نوجوان کے سامنے چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے؟ سکون کی تلاش میں اس کا مضطرب دل کبھی میخانہ' کبھی کاشانۂ شہناز کا سہارا ڈھونڈنے پر اور کبھی گھبرا کر مجنوں کی پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نوجوان کو عشق کی ذاتی ناکامی ونامرادی کا بھی سامنا ہے۔ اس کی وجہ اہل ثروت اور ان کا نظام ہے۔ دولت کی دیوار حائل ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کو عشق میں ناکام پاتا ہے۔ رسوائیاں اسے سراسیمہ کیے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ عشق کی منزل کا ایسا راہی ہے جو راستے میں رک کر دم لینے کا عادی نہیں۔ اسے اپنی تنہائی کا بھی شدید احساس ہے مگر پاس وفا اسے کسی اور در کی طرف جانے نہیں دیتی۔

(9 تا 12 بند) یہ نوجوان عاشق ایک مرتبہ جھنجھلا کر عہد وفا کو توڑ دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن معاً اسے اپنے عہد کے ان حالات کا خیال آتا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اس کا یہ غم اجتماعی ہو جاتا ہے۔ نظم کی ان بندوں میں انفرادیت بھی ہے' شدت احساس بھی اور ہندوستان کے نوجوان نسل کی ترجمانی بھی۔ مجازؔ نے

ایک نسل کے ترجمان کی حیثیت سے محسوس کیا ہے۔ چاند کو کریہہ صورت کہنا' اس کو ملاّ کا عمامہ' بنیے کی کتاب' مفلس کی جوانی اور بیوہ کا شباب کہنا بذات خود استحصال کرنے والی قوتوں یا استحصال شدہ لوگوں اور مظلوموں کی علامتیں ہیں اور ادبی روایات سے بغاوت ہے۔ اب تک یہ مسرور ہونے کی شئے سمجھی جاتی تھیں۔ انسانیت کی عام زبوں حالی کا احساس کر کے شاعر کے سینے کے زخم مہک اٹھتے ہیں۔ اس کی جھنجھلاہٹ شدید ہو جاتی ہے۔ عزائم خطرناک نظر آتے ہیں۔ چاند تاروں میں اسے کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ وہ انہیں مردہ قرار دیتا ہے اور نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔

(13 تا 15 بند) شاعر ان سامان عیش و عشرت کو نوچ پھینکنے کی بات سوچ رہا تھا کہ اس ذہنی کشمکش کے ردعمل میں اس کے اندر جانفشانی اور جاں بازی کا جذبہ عود کر آتا ہے اس میں ایک احساس برتری جاگنے لگتا ہے اور اس میں ان تمام سماجی حالات کو جو اُس کی راہ کی رکاوٹ تھے بدل ڈالنے کی خواہش اور سب کچھ کر گزرنے کا عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ قوم کی مفلسی و ناداری کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور اس عہد کے ذمہ داروں' جابر حکمرانوں کے خلاف اس کا جوش انتقام انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ سینکڑوں چنگیز و نادر اس کی نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے خنجر اور ان کے تاج کے بیش بہا پتھر توڑ دینے کی خواہش اس کے دل میں انگڑائیاں لیتی ہے۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اندر سبھا کو سارے ساز و سامان اور قصر سلطان کی ہر چیز کو پھونک دینا چاہتا ہے۔ نظم کے ان بندوں میں ناشاد و ناکارہ پھرنے' آوارہ گردی میں مصروف رہنے' مردہ چاند تاروں کو نوچنے' چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر لے کر توڑنے' گلشن شبستاں' تخت سلطاں اور قصر سلطاں کو پھونک دینے کا جو تصور ہے وہ شاعر کے انقلابی میلان کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ نظم ایک انقلابی نظم ہے۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے جو حالات کو سنوارنے' ماحول کو نکھارنے اور فضا کو سازگار بنانے کے لیے زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔ یہ تبدیلی انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس نظم میں مجاز نے اسی انقلاب کا خواب دیکھا ہے۔

12.5.2 نظم آوارہ کا مجموعی تاثر

''آوارہ'' اس سر پھرے باغی نوجوان کی ترجمان ہے جو مفلسی اور بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے ہی شہر کی

سڑکوں پر آوارہ وسرگرداں پھرنے پر مجبور ہے۔اس کے پس منظر میں مجاؔز کے دور کے معاشی وسماجی حالات ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کا شکار ہوکر مجاؔز خود بھی بے کار و آوارہ پھرتے رہے۔ایک سرکش باغی کی ساری سرکشی و آوارگی پورے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور اس کے ذہن میں اس پورے نظام کو درہم برہم کرنے کا خیال موجزن ہوتا ہے جس میں آرزوؤں اور خوشیوں کا خون ہوا ہے۔ جہاں مفلسی' بے کاری' بے روزگاری اور ناکامی اس کا نصیب بن گئی۔ یہ نظم صرف مجاؔز ہی کی نہیں بلکہ اس دور کے تمام باغی حساس اور مضطرب نوجوانوں کے تصورات وجذبات کی آئینہ دار ہے۔

شاعران حالات میں جھنجھلایا ہوا جیتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ گھومتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس نظام کو جس کی بنیاد ظلم وستم پر ہے کس طرح بدل ڈالے۔اس عالم وحشت میں وہ اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دل میں کچلی ہوئی خواہشات کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے وہ زخم جو بظاہر دب گئے تھے مہک اٹھتے ہیں اور شاعر کا جذبہ انتقام جاگ اٹھتا ہے۔اس کی اجتماعی سوچ ابھرنے لگتی ہے۔ مفلسی کے مارے بھوکے' ننگے عوام اس کی نظروں کے سامنے آتے ہیں اور چنگیز ونادر کے مظالم اسے یاد آتے ہیں جس کے ردعمل میں وہ اپنی ساری قوت وہمت مجتمع کرکے چنگیز کے ہاتھوں کا خنجر توڑنے اور اندر سبھا کے ساز وسامان پھونک دینے کا فیصلہ کرلیتا ہے جن کی گردنوں پر کروڑوں غریب انسانوں کا خون ناحق ہے۔وہ ان ظالموں کا گلشن اور ان کے قصرِ یعنی محل کو نیست ونابود کردینا چاہتا ہے۔اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان ہے لیکن خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وسائل نہیں اس لیے وہ گھبرا کے کہتا ہے:

اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. ''آوارہ'' کیسی نظم ہے؟

10. وہ کیسا ماحول تھا جس سے متاثر ہوکر مجاؔز نے نظم ''آوارہ'' تحریر کی؟

12.6 خلاصہ

اسرارالحق مجاز 1911ء میں بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ ادبی اور علمی ماحول میں پرورش پائی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی اور ہارڈنگ لائبریری میں ملازم رہے۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے اور حلقۂ ادب لکھنؤ کے سرگرم رکن بنے۔ ادارہ نیا ادب سے بھی منسلک رہے۔ مجاز ایک حساس اور حقیقت پسند انسان اور شاعر تھے۔ متوسط طبقہ کی بے روزگاری' ابتری اور بدلتے ہوئے سماجی و اخلاقی معیار سے وہ متفکر تھے۔ ان کی شاعری میں سماج کی ابتری اور فرسودہ نظام سے بغاوت کا پیغام ملتا ہے۔

''آوارہ'' اس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو اپنی نہ جانے کتنی آرزوئیں' امنگیں' حسرتیں اور تمنائیں لے کر اپنی ہی بستی میں تنہا مارا مارا پھر رہا ہے۔ مگر جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پھر بھی اُس کے ساتھ ہے۔ مختلف خیالات کی لہریں اس کے دل میں اٹھتی ہیں۔ اس کی عملی شکل اس کے یہاں موجود نہیں ہے کیوں کہ حالات اس کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ نظم میں اس نوجوان کی صحیح تصویر موجود ہے۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. ''آوارہ'' کا مجموعی تاثر بیان کیجیے۔

2. درج ذیل بند کی تشریح کیجیے:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے چمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں لکھیے :

1. مجاؔز کی حیات اور شاعری کے بارے میں لکھیے۔
2. ''آوارہ'' انقلاب اور رومان کا امتزاج ہے.....بیان کیجیے۔
3. ''آوارہ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

12.8 فرہنگ

ستم گاری	تشدد، زیادتی، ظلم	آئین	قاعدہ، قانون، ضابطہ، رواج
نظامِ کہنہ	پرانا طریقہ، پرانی روش	متضاد	برعکس، خلاف
فرسودہ	گھسا ہوا، پرانا	کریہہ صورت	قابلِ نفرت، بدشکل، بدصورت
حرماں نصیبی	بدقسمتی، جس کی قسمت میں محرومی ہو		
کاشانہ	چھوٹا سا گھر	اندوہ	رنج، غم، فکر و تردد
سراسیمہ	حیران، پریشان	عزائم	عزم کی جمع، مصمم ارادہ
قصرِ سلطان	بادشاہ کا محل، ایوان	شبستاں	حرم سرا
سدِّ راہ	راستے کی رکاوٹ	نیست و نابود	بالکل فنا کر دینا

12.9 معاون کتابیں

1. مجاؔز۔ شخص اور شاعر : ڈاکٹر معیزہ عثمانی

2. مجاؔز-حیات اور شاعری : منظر سلیم

3. جدید شاعری : ڈاکٹر عبادت بریلوی

4. بیسویں صدی کی اُردو شاعری : اوصاف احمد (انتخاب و ترتیب)

12.10 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اسرار الحق

2. 19/ اکتوبر 1911ء کو ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے قصبہ ردولی میں

3. فاؔنی بدایونی، معین احسن جذؔبی، حسرؔت موہانی، میکشؔ اکبر آبادی، اصغر گونڈوی

4. مجاؔز کی

5. آگرہ، علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ

6. مجاؔز بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اُردو شاعری کو انقلاب کا صحت مند موڑ دیا۔ ان کے انقلابی رنگ میں جمالیاتی شعور بھی موجود ہے۔

7. مجاؔز عورتوں کو اسی دُنیا کی عورت کی طرح پیش کرتے تھے اور اُنہیں مردوں کے دوش بدوش دعوت عمل دیتے تھے۔

8. ہاں۔ یہ دُرست ہے۔

9. 'آوارہ' ایک انقلابی نظم ہے جس میں ایک حساس نوجوان کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔

10. وہ ظلم وزیادتی، ناانصافی، حق تلفی کا دور تھا۔ چاروں طرف مفلسی اور بے روزگاری تھی۔ ایسا نظام قائم تھا جس کی بنیاد ہی ظلم و ستم پر تھی۔

بلاک نمبر-4
نظم

اکائی ۱۰۔علی سردار جعفری۔ 'ہاتھوں کا ترانہ'
اکائی ۱۱۔فیضؔ احمد فیضؔ۔ 'صبح آزادی' (اگست ۱۹۴۷ء)
اکائی ۱۲۔اخترؔ الایمان۔ 'ایک لڑکا'

اکائی 10 : علی سردار جعفری
(نظم : ہاتھوں کا ترانہ)

ساخت

13.1 اغراض و مقاصد

13.2 تمہید

13.3 سردار جعفری کی حیات

13.4 سردار جعفری کی شاعرانہ خصوصیات

13.5 سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' کا متن

13.6 نظم کا خلاصہ

13.7 نظم کی تشریح

13.8 خلاصہ (اکائی کا)

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.10 فرہنگ

13.11 معاون کتابیں

13.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

13.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' سردار جعفری کی حیات' شاعری کی خصوصیات اور اُردو نظم کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ نظم قدیم صنفِ سخن ہے۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں ادب میں ہمیشہ موجود رہی

ہے۔ترقی پسند تحریک نے نظم کی ترویج واشاعت میں ایک اہم رول ادا کیا اور نظم کے دامن کو مختلف النوع مضامین سے مالا مال کیا۔ زیرِ نظر اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اُردو کی نظمیہ شاعری کے موضوعات سے واقف ہو جائیں گے جس سے آپ کو عام زندگی میں بھی نظم کے موضوعات اور اظہار کی کیفیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

13.2 تمہید

نظم اپنے ابتدائی دور سے ہی خارجی و داخلی دونوں قسم کے تاثرات کو پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ وقت اور حالات کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ نظم کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔اور اس میں مختلف قسم کے موضوعات جگہ پانے لگے جس میں فکر وفلسفہ، مناظرِ قدرت وغیرہ اہم ہیں۔نظیر اکبر آبادی نے نظم کے موضوعات کو اور وسعت دی اور اس میں میلے ٹھیلے، تاریخ کی اہم شخصیتوں اور تاریخی مقامات جیسے موضوع کو سمویا۔زندگی کی بے اعتباری پر بھی انہوں نے نظمیں لکھیں۔

1857ء کے بعد جب نظم کا سفر آگے بڑھتا ہے تو اس کو حالؔی، اکبؔر کے بعد اقباؔل جیسا عالم، دانشور اور فلسفی ملتا ہے جس نے اُردو نظم کی سرپرستی کی۔اور پھر اُردو نظم کو ترقی پسند تحریک کی سرپرستی ملتی ہے۔اور اس کا دامن مزید وسعتوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔اور اب اس میں سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔سردار جعفری ترقی پسند شاعر تھے۔ترقی پسندی ان کے رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی۔اس لیے سردار جعفری کے یہاں بھی سارے مضامین جگہ پاتے ہیں۔نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' دراصل ان مزدوروں اور فنکاروں کا قصیدہ ہے، جن کی محنت پر تمدن کا چراغ جلتا ہے۔اس نظم کے ذریعہ انہوں نے مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

13.3 سردار جعفری کی حیات

سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔سردار جعفری کی پیدائش یوپی کے ایک قصبہ بلرام پور میں 29 نومبر 1913ء کو ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی۔سردار جعفری کا خاندان کئی پشت پہلے بھرت

پور میں آباد تھا۔لیکن حصولِ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں یہ لوگ رفتہ رفتہ آگرہ اور بلرام پور میں آ کر بس گئے۔ والد کا نام سید جعفر تھا۔ جن کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے تھا اور وہ ریاست بلرام پور کے اہم عہدوں پر فائز رہے تھے۔ والدہ کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔ سردار جعفری نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد ایسا ماحول دیکھا جو اس عہد میں ایسے گھرانوں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ شان وشوکت' کروفر اور جاہ وجلال۔لیکن ایک شیعہ گھرانے کی وجہ سے علم اور تہذیب کے معاملہ میں اس وقت کے دیگر زمین دار گھرانوں سے تھوڑا مختلف تھے۔ سردار جعفری اس وقت کے حالات پر ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' میں ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

''خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے بعد علی گڑھ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہوجاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں' راشدالخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔ اس سے تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوجاتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے تھے۔''

معاشی اعتبار سے سردار جعفری کا بچپن بہت آرام وسکون اور بے فکری میں گزرا۔

سردار کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ گھر میں محرم ومجلس کا ماحول تھا اور انیس کے مرثیے فضا میں گونجا کرتے تھے۔ بقول جعفری کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کے مرثیوں کی سنی۔ چونکہ والدین کا ارادہ انہیں مولوی بنانے کا تھا اس لیے ان کا داخلہ سلطان المدارس لکھنؤ میں کرادیا گیا۔لیکن 1925ء میں سردار نے سلطان المدارس چھوڑ دیا اور بلرام پور ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ محض سترہ' اٹھارہ' برس کی عمر میں 1930ء میں وہ بلرام پور کے مخصوص ومحدود ماحول سے نکل کر لکھنؤ پہنچے۔ اسی درمیان انہوں نے نوکری کا امتحان دیا۔ پاس ہوئے اور جہاز رانی (ممبئی) میں ان کا تقرر ہوگیا۔لیکن والدین نے انہیں واپس بلالیا۔ 1933ء میں علی گڑھ

یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ 1933ء میں سردار جعفری کا داخلہ بی۔اے سالِ اول میں ہوا لیکن کالج کی سیاست میں سرگرم عمل ہونے اور 1936ء میں طلبہ کے ایک ایجی ٹیشن میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔اس کے بعد سردار نے اینگلو عربک کالج دلی میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے بی۔اے کرنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔اسی زمانے میں ان کا افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' 1938ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

لکھنؤ میں قیام کے دوران 1939ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لیا اور صرف پہلا سال ہی پاس کر سکے۔ 1937ء میں جب آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد پڑی تو سردار جعفری ابتدا سے ہی اس میں شریک تھے۔ بعد میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری ہو گئے تھے۔طالب علموں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے اور طلبہ کے لیڈر کی حیثیت سے ان کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔ 1936ء میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی اور لکھنؤ میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔سردار اس تحریک میں ایک ممتاز کارکن کی حیثیت سے ابھرے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی خطابات کے جوہر بھی کانفرنسوں اور جلسوں میں دیکھے جاتے تھے۔

1940ء میں جنگ مخالف پروپگنڈہ کرنے پر انہیں حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔لکھنؤ اور بنارس کی جیلوں میں رہنا پڑا۔ رہائی کے بعد انہیں گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ادبی و سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایم۔اے بھی مکمل نہ کر سکے اور 1942ء کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے ممبئی چلے گئے۔

سردار جعفری ایک پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ سلطانہ منہاج، جن کی شادی ہو چکی تھی۔ سردار جعفری کی جاذبیت اور پر کشش شخصیت پر کچھ اس طرح فریفتہ ہوئیں کہ اپنے پہلے شوہر سے علاحدگی اختیار کر لی اور بعد میں 30 جنوری 1948ء کو سردار جعفری کی شریکِ سفر بن کر ان کے ساتھ ممبئی چلی گئیں اور سردار کی آخری سانس تک ان کی ہم سفر اور شریکِ زندگی رہیں۔ سردار جعفری نے اپنی مشہور نظم میرا سفر میں ان کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

''ہر عاشق ہے سردار یہاں

ہر معشوقہ سلطان ہے''

سردار جعفری کی ادبی زندگی کا آغاز 15 سال کی عمر میں ہوا جب انہوں نے اپنا پہلا مرثیہ لکھا۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے

اپنی جلو میں فوجِ صداقت لئے ہوئے

17 سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی اور ڈرامے بھی لکھے۔ سب سے پہلا ڈرامہ ''دو دیوانے'' رشید احمد صدیقی کے رسالہ ''سہیل'' میں شائع ہوا۔ مرثیہ کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہتے تھے اور حزیں تخلیص اختیار کیا۔ اُردو ادب میں سردار جعفری کی بیک وقت کئی حیثیتوں سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک حیثیت شاعری تو ہے ہی' اس کے ساتھ وہ افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' نقاد' مترجم' صحافی اور مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی سرکاری ملازمت نہیں کی۔ سردار جعفری بیک وقت اُردو' فارسی اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ 9 شعری مجموعوں کے علاوہ افسانوں کا مجموعہ منزل'' ''ڈرامہ'' یہ کس کا خون ہے۔ ترقی پسند ادب اور اقبال شناسی پر تنقیدی کتب کے علاوہ سوانحی تنقید اور نثر کی کتابوں کے علاوہ بہت سی دوسری تخلیقات مثلاً ترجمے وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ سردار جعفری رسالہ ''نیا ادب'' اور اخبار ''پرچم'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''قومی جنگ'' اور ''نیا زمانہ'' کے ادراتی بورڈ کے رکن اعلیٰ تھے۔ ترقی پسند ادب کا ترجمان رسالہ ''گفتگو'' شائع کیا۔ ہندوستانی بک ٹرسٹ کے مدیر اور کتاب نما دہلی کے مہمان مدیر رہے۔ فلمی اور ٹی۔ وی کی دنیا بھی ان سے اچھوتی نہ تھی۔ غیر ممالک کے سفر بھی کیے۔

مجموعی خدمات کے سلسلے میں ملک کے اہم ترین اور باوقار اعزاز ''گیان پیٹھ'' سے سرفراز کئے گئے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اعزازات سے نوازے گئے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان سے بھی انہیں 1978ء میں گولڈ میڈل دیا گیا۔ 1986ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ علی گڑھ اور جموں یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ان کی نظموں کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

عرصہ دراز تک علیل رہنے کے بعد یکم اگست 2000ء کو صبح آٹھ بجے برین ٹیومر کے سبب ممبئی اسپتال میں ان

کی روح عالمِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف پرواز کرگئی۔ جوہوقبرستان ممبئی میں انہیں سپرد خاک کردیا گیا۔

سردار جعفری کی شخصیت کی تعمیر میں بلاشبہ ان کے گھر کے مذہبی ماحول اور حضرت امام حسینؑ کی دلیرانہ وحق پرستانہ کردار نے اہم رول ادا کیا۔ اوران کے اندر یہ احساس جگا دیا کہ حق وصداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی معراج ہے۔ انیس، اقبال، میر وغالب، گاندھی، نہرو، لینن، گوئٹے ورڈز ورتھ کو پڑھ کر اور پھر کارل مارکس کے منشور کے مطالعے نے ان کے سامنے جہانِ معنی کے دروازے کھول دیے۔ علی گڑھ کی علمی وفکری، سیاسی اور انقلابی فضا نے بھی سردار جعفری کی شاعرانہ فکر ونظر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد کب پڑی؟
2. سردار جعفری کو جیل کب جانا پڑا؟
3. سردار جعفری کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

13.4 سردار جعفری کی شاعرانہ خصوصیات

یہ سچ ہے کہ سردار جعفری کو پہلا صوبائی انعام 1938ء میں ان کے کسی نظم کے مجموعے پر نہیں بلکہ افسانوی مجموعہ ''منزل'' پر ملا تھا۔ لیکن اول تا آخر وہ ایک شاعر تھے۔ ترقی پسندی سے وابستگی نے ان کے ذہن کی گرہیں کھول دیں تھیں اور فن کو جلا بخشی تھی۔ چونکہ ان کا تعلق سرمایہ دارانہ طبقہ سے تھا۔ اس لیے انہوں نے اس ظلم وجبر کا مشاہدہ کیا جس کا اس عہد میں چلن تھا۔ جسے غریبوں، محنت کشوں اور مظلوموں کی تقدیر اور مشیتِ ایزدی سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور تلخ حقائق کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا۔ ان پر وہ تمام راز کھلتے چلے گئے جن کی بنا پر معاشرہ میں ظالم ومظلوم، حاکمیت اور محکومیت اور جبر واستبداد جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ چونکہ سردار جعفری امام حسینؓ کی بے مثال قربانی سے بے حد متاثر تھے اس لیے انہوں نے جبر واستبداد، ظلم اور ناانصافی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا اور بقول فیض ع

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

سردار جعفری عتاب کا نشانہ بھی بنے اور نتیجتاً قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ انگریز سپاہیوں کے ڈنڈے کھائے، گالیاں بھی سنیں۔ چونکہ ان کا دل پختہ اور دماغ روشن تھا اس لیے وہ ان سب باتوں سے بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے اور اپنی منزل کی طرف ثابت قدمی سے چلتے رہے۔ شاعری کی مروجہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے شاعری میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کی۔ نظم میں تو ہر قسم کے خیالات باندھے جاتے ہیں لیکن غزل کے لیے ایسا کہا جاتا ہے کہ وہ صرف گل و بلبل کے افسانے محبوب کی کج ادائیوں اور لب و رخسار کی باتوں تک محدود ہے۔ سردار نے نظم و غزل میں یکساں طور پر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کی۔ غزل کے مروجہ طلسم کو توڑ کر اس کے دامن کو محبت کی حقیقی شکل غربت و افلاس' بھوک' ظلم و ناانصافی کے خلاف بغاوت' آزادی کی تمنا' غلامی کا کرب اور اس کا خواب جیسے موضوعات سے مالا مال کیا۔

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ' آئے ناتمام آئے

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' 1943ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں شامل نظمیں سماج' بغاوت' انگڑائی' مزدور لڑکیاں' اشتراکی' زمانہ' تاریخ' آثارِ سحر' ارتقا و انقلاب' جنگ اور انقلاب وغیرہ ان کے انقلابی تیور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس میں رومانی رنگ کی نظمیں نہیں ہیں۔ 'جوانی' ان کی رومانی نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس میں بھی رومانیت کم انقلابیت زیادہ ہے۔

حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مذہب' میرا مسلک نوجوانی ہے

نظم بغاوت کا صرف ایک شعر ان کے جذبات و احساسات اور افکار کے اندازے کے لیے کافی ہے۔

بغاوت میرا مذہب، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

چونکہ اس مجموعے میں 1946ء سے قبل کی شاعری ہے لہٰذا یہ فطری ہے کہ اس عہد کی شاعری میں آزادی، انقلاب اور غلامی سے نجات کا ولولہ اور دور دورہ ہے۔ لیکن شاعری میں صرف خطابت اور کھوکھلا پن نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بدلتے ہوئے عہد، سردار کے مزاج اور فکر کی بھی نمائندگی ہوتی ہے۔ نئے معاشرہ کی تلاش، نئے خواب دیکھنے کی خواہش پھر اس کی تعبیر کی تلاش وغیرہ۔ ایسا صرف ملکی سطح پر نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے اس میں عالمیت کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ رنگ صرف وقتی آزادی کا نہیں بلکہ نئے سماج کے نئے تصورات کا رنگ ہے جو بہرحال قدیم رنگ سے مختلف ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ان کے کلام میں رومان و انقلاب کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ رومان و انقلاب کی یہی ملی جلی کیفیت ان کے اس عہد کی شاعری کا خاصہ ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت عورتوں کے حوالے سے ان کا دردمندانہ اظہار ہے۔ یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جوانی کی عمر میں بھی جعفری ملک و معاشرے اور عام انسانوں کے دُکھ درد سے کس قدر گہری واقفیت اور وابستگی رکھتے تھے۔ جہاں عورت کے حوالے سے بات ہوتی ہے وہاں ان کی آواز، ان کا دردمندانہ اظہار بڑی شدت سے ابھرتا ہے۔ عورتوں کے ذریعہ دنیا کے نظام کو بدلنے کا تصور پہلی بار سردار کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ان کی شاعری اور فکر و نظر کی انفرادیت ہے۔

سردار جعفری کا دوسرا مجموعہ کلام ''نئی دنیا کو سلام'' 1948ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ان کی طویل نظم 'نئی دنیا کو سلام' شامل ہے۔ جو نظامِ نو کی خوشخبری دیتی ہے۔ اس نظم کا سب سے خوبصورت حصہ محبت ہے۔ جو مریم کی شکل میں مختلف روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ مریم صرف ایک بیوی، محبوبہ نہیں ہے۔ بلکہ ماں بھی ہے اور اس سے زیادہ ایک باغی عورت بھی جسے سردار جعفری اس روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔

وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے   تبسم نہیں صرف تلوار بھی ہے
وہ ہر گام پر مرد کی ہمسفر ہے   وہ شمع شبستاں ہے نورِسحر ہے

جوش اور اختر شیرانی نے عورت کی روایتی امیج کو توڑنے کا جو کام کیا تھا اسے مجاز نے آگے بڑھایا اور

"ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے پرچم بنالیتی تو اچھا تھا"

کہہ کر پوری ترقی پسند شاعری میں عورت کے کردار کو ہی بدل دیا۔فیض کی محبوبہ ہو یا کیفی کی عورت' مجروح و ساحر کی ہم سفر سبھی نے باغیانہ ہم سفری ہم نظری کے منظر پیش کیے ہیں۔لیکن سردار کی مریم صرف جاوید کی بیوی یا ہندوستان کی عورت نہیں بلکہ پوری دنیا کی بہادر عورتوں کی علامت بن جاتی ہے۔اور سردار کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

فروزاں ہے شمع حیات اس کے دم سے   ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے
وہ آغوشِ تہذیب کا گہوارہ   اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ

ترقی پسند ادب میں سردار جعفری خود لکھتے ہیں:

"اب یہ نئی عورت ہمارے ادب میں قدم رکھ رہی ہے.......... جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصہ حاصل نہیں کرے گی تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے۔اب عورت کے تصور میں گہرائی پیدا ہورہی ہے۔جو بہترین قسم کی حقیقت نگاری ہے۔" (ترقی پسند ادب۔صفحہ 241)

عورت کے بارے میں سردار کے اس روشن اور ارتقائی نظریہ کی وجہ سے پرواز کی 'مزدور لڑکیاں' 'نئی دنیا کو سلام' تک پہنچتے پہنچتے ذہین باغی عورتوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔مزدور لڑکیاں میں سردار خود بولتے ہیں اور نئی دنیا کو سلام میں عورت خود بولنے لگتی ہے۔1946ء میں ہندوستان کی سیاسی فضا نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر حالات خراب ہونے لگتے ہیں۔امن کا یہ سپاہی ان حالات سے دلبرداشتہ ہوجاتا ہے اور اپنی سیاسی مثنوی 'جمہور' میں طنزیہ

انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔آزادی آئی اور اپنے جلو میں فرقہ وارانہ فسادات قتل و غارت گری، مذہب و ملت کی تفریق کی سوغات لے کر آئی۔ جس نے اہلِ علم و دانش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سردار جعفری بھی اس طرح کی آزادی سے متاثر ہوئے۔ آزادی کے فوراً بعد کی شاعری میں ایک نئے سردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شاعری میں انقلاب اوراحتجاج کا لہجہ ابھر کر سامنے آیا۔حکومت کے خلاف شاعری کرنے کے نتیجے میں انہیں گرفتار کرلیا گیا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ یہ زمانہ ان کی شاعری کے لیے بہت سازگار تھا۔خون کی لکیر 1949ء میں پتھر کی دیوار 1953ء میں شامل نظمیں اس عہد کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہیں ۔ ان مجموعوں میں شامل کم و بیش سبھی نظمیں ہنگامی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ لہجے میں گھن گرج اور خطیبانہ آہنگ ہے۔ انقلابی آہنگ کی واضح مثال نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' بھی جیل میں لکھی گئی۔ ناسک جیل میں لکھی جانے والی نظمیں ان کی شاعری میں نئے جہات اور نئی سمتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ 'جیل کی رات' (خون کی لکیر)، 'نیند' اور 'تمہاری آنکھیں' (پتھر کی دیوار) میں سردار کا رنگ و لہجہ اور فکر و آہنگ ان کے اپنے مخصوص اسلوب میں بدل جاتا ہے۔ یہ نظمیں علامتوں اور استعاروں کے فطری استعمال اور پیکر تراشی کی خوبصورت مثال پیش کرتی ہیں۔

قید و بند کی صعوبتوں نے ان کے شعری سفر کو نئی جہت اور نیا زاویہ عطا کیا۔اس عہد کی متعدد نظموں میں ذاتی واردات اور احساسات کی ترجمانی بڑے ہی موثر انداز میں ملتی ہے۔اس کی اہم مثال نظم ''میرا سفر'' ہے۔ یہ نظم زندگی کی قوتِ نمو، تسلسلِ حیات اور وقت کے تصورات کو پیش کرتی ہے۔ نظم کا آغاز موت کے تصور سے ہوتا ہے لیکن حیاتِ نو کی بشارت دیتے ہوئے سردار اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

سردار جعفری کی باغیانہ شاعری' ان کا غم وغصہ' ان کی نفرت اور ان کا انقلاب ان کا ذاتی نہیں بلکہ اس کی بنیاد انسان اور زندگی سے شدید محبت پر رکھی ہوئی ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کا آخری عہد 1953ء تا 1968ء ان کی شاعری کی سنجیدگی اور گہرائی کا دور ہے۔ اس دور کی نظموں میں رومان' حقیقت' اشتراکیت' سماجیت سبھی کچھ نئے پیرایہ اظہار وافکار وآثار میں نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں' مختلف ومتفرق اشعار میں بلا کی رومانیت اور کیفیت تو ہے ہی سنجیدگی اور بالیدگی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں زندگی کا ٹھوس نظریہ اور فلسفیانہ گہرائی نظر آتی ہے۔ نظمیں زندگی کے جہدِ مسلسل اور اس کے اسرار ورموز پر فلسفیانہ روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی نظموں میں صرف فلسفہ ہی نہیں ہے۔ سنجیدہ رومان تحیر وتجسس آمیز حقیقتوں کے مرقع بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں سیاسی وسماجی عوامل کارفرما ضرور ہیں لیکن ان میں روح کا کرب اور دل کی تپش بھی دکھائی دیتی ہے۔

سردار بنیادی طور پر حق پرستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔ جو فی زمانہ ترقی یافتہ شکل میں مارکسزم اور پروگریسوازم میں بدل جاتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہن وشعور تاریخ وتہذیب کے انہیں معاملات میں رچا بسا ہے۔ نظم ''یہ لہو'' کا یہ بند اس کی مثال ہے۔

یہ لہو کافر نہیں' مرقد نہیں' مسلم نہیں
کلمۂ حق کا اجالا' یہ تجلی یہ ظہور
یہ لہو' میرا لہو' تیرا لہو' سب کا لہو

اور سردار جعفری کی شاعری، ترقی پسند شاعری میں ایک الگ ڈکشن اور پہچان بناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. سردار جعفری کو پہلا صوبائی انعام کب ملا؟
5. قید وبند کے زمانے کی نظمیں کس مجموعہ میں شامل ہیں؟
6. سردار کی کسی ایسی نظم کا نام لکھیے جس میں عورت کے مختلف رنگوں کا ذکر ہو۔

13.5 علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' کا متن

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے انساں کی کہانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب تحریریں اور تقریریں ہیں
یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی انسانوں کی تقدیریں ہیں
سب حکمت و دانش، علم و ہنر ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

13.6 نظم کا خلاصہ

سردار جعفری فنکاروں کے ہاتھوں میں مخفی قوت سے آگاہ ہیں۔ اپنی نظم ہاتھوں کا ترانہ میں وہ فنکاروں کے ہاتھوں کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی تعظیم کرنے پر زور دیتے ہیں۔

صناعوں اور کاریگروں کے ہاتھ وہ ہاتھ ہیں جو فطرت کے شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ان ہاتھوں کی عظمت کو تسلیم کریں۔ انہیں کے دم سے کاروبارِ حیات آگے بڑھتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان کی عظمت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ تاریخ کے صفحات اور مشینوں کے پہیے ان کے دم سے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو تہذیب و

تمدن کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یہی وہ ہاتھ ہیں جو دنیا اور دنیا میں رہنے والے لوگوں کی کہانی لکھتے ہیں۔اس لیے ہمیں ان ہاتھوں کی عزت کرنی چاہیے۔

یہ وہ ہاتھ ہیں جن کے بنا تحریریں اور تقریریں بے معنی ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو علم و ہنر اور عقل مند' دانشوروں کی تفسیریں پیش کرتے ہیں۔اس لیے ہمیں ان ہاتھوں کی تعظیم کرنی چاہیے۔

13.7 نظم کی تشریح

انسان حیات و کائنات کا مرکز و محور ہے۔ انسان کے بنا کائنات کے وجود کا تصور ممکن نہیں۔ لیکن اپنے مفاد کی خاطر انسان بھی انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہ دنیا مجبوروں' محکوموں' سرمایہ داروں' فنکاروں' کسانوں' مزدوروں' اہلِ علم و دانش کا گہوارہ ہے اور ان سب کے درمیان ہاتھوں کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ اپنی نظم ہاتھوں کا ترانہ میں انہوں نے فنکاروں کے ہاتھوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لوگوں کو بھی اس کی تعظیم کرنے پر زور دیا ہے۔

ان ہاتھوں کی .... تسلیم کرو۔

سردار جعفری فنکاروں کے ہاتھوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فنکاروں کے درد سے واقف تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ فنکار جو دنیا کو چلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جن سے تہذیب و تمدن کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ وہی لوگ کبھی کبھی بے آسرا و مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا۔ نہ ہی ان کے فن کی ستائش ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کو چلانے کی طاقت ہے ہمیں ان ہاتھوں کی قوت کو تسلیم کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم و تکریم کرنی چاہیے۔

تاریخ کے .... تعظیم کرو

فنکاروں کے ہاتھ' تاریخ دانوں کے ہاتھ' مزدوروں کے ہاتھ' اہلِ علم و دانش کے ہاتھ۔ غرض یہ ہاتھ وہ ہاتھ ہیں جن سے کارخانۂ حیات میں رنگینیاں، رعنائیاں اور خوشیاں ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو پتھر کو بت بنا دیتے ہیں۔ جو تاج محل' مصر کے اہرام وغیرہ بنا کر ایک تاریخ مرتب کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو کارخانوں میں مشینوں کو چلا کر انسانی

ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو زمین کے اندر سے معدنیات نکال کر، زرخیز زمینوں میں غلہ پیدا کر کے تہذیبوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو طرزِ معاشرت کو بدل کر رکھ دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو دنیا اور دنیا میں رہنے والوں کی کہانی لکھ کر ایک تاریخ مرتب کر دیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوسکیں۔ ہمیں ایسے عہد ساز ہاتھوں کی عزت کرنی چاہیے۔

یہ ہاتھ نہ ہوں..................تعظیم کرو

شاعر ان ہاتھوں کی مخفی قوت سے واقف ہے اور اصل خوبی مادۂ تعمیر سے آگاہ۔ اس لیے وہ انہیں ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لیے پکارتے ہیں۔

اس بند میں بھی شاعر ان ہاتھوں کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ہاتھ یعنی فنکاروں، صناعوں اور کاریگروں کے ہاتھ نہ ہوں تو تحریریں اور تقریریں سب بیکار ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو اگر نہ ہوں تو انسانوں کی تقدیریں بے معنی ہیں کیوں کہ ان ہاتھوں میں تقدیروں کو بدل دینے کی طاقت پنہاں ہے۔ اہلِ علم و دانش کی ساری دانائی و حکمت دھری کی دھری رہ جائیں اگر یہ ان کی وضاحت نہ کریں۔ اس لیے ہمیں ان ہاتھوں کی تعظیم کرنی چاہیے اور ان کی عزت کرنی چاہیے۔ ترقی پسند شاعری میں یہ نظم اپنی طرح کی الگ شناخت رکھتی ہے جس میں سردار نے فنکاروں کے ہاتھوں کی تعظیم کی بات کی ہے۔

13.8 خلاصہ (اکائی کا)

سردار جعفری ترقی پسند شاعر تھے۔ اُن کا شمار بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ سردار جعفری کی پیدائش یوپی کے ایک قصبہ بلرام پور میں 29 نومبر 1913ء کو ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی۔ سردار کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ گھر میں محرم و مجلس کا ماحول تھا اور انیس کے مرثیے فضا میں گونجا کرتے تھے۔ بقول جعفری کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کے مرثیوں کی سنی۔ سردار جعفری اپنے علاقے کے اسکولوں کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دلّی کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے اور ہر جگہ اسٹوڈنٹس یونین میں سرگرمی سے حصہ لیتے

رہے۔ 1936ء میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ سردار اس تحریک میں ایک ممتاز کارکن کی حیثیت سے ابھرے۔ انہیں حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ لکھنؤ اور بنارس کی جیلوں میں رہنا پڑا۔ رہائی کے بعد انہیں گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ سردار جعفری کی شادی سلطانہ منہاج سے 30 جنوری 1948ء کو ہوئی۔ وہ سردار کی آخری سانس تک ان کی ہم سفر اور شریکِ زندگی رہیں۔

سردار نے 15 سال کی عمر میں شاعری اور 17 سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔ گرچہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن اس کے ساتھ وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، نقاد، مترجم، صحافی اور مقرر بھی بہت اچھے تھے۔ اُنہوں نے کبھی سرکاری ملازمت نہیں کی۔ ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی جانب سے انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا گیا جس میں گیان پیٹھ بھی شامل ہے۔ 1986ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ یکم اگست 2000ء کو برین ٹیومر کے سبب ممبئی اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' 1943ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں شامل نظمیں سماج، بغاوت، انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشتراکی، زمانہ، تاریخ، آثارِ سحر، ارتقا و انقلاب، جنگ اور انقلاب وغیرہ ان کے انقلابی تیور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اُن کا دوسرا 'نئی دنیا کو سلام' 1948ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' شامل ہے۔ سردار بنیادی طور پر حق پرستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔

نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' سردار جعفری کی معروف نظموں میں سے ایک ہے جو دراصل ان مزدوروں اور فنکاروں کا قصیدہ ہے، جن کی محنت پر تمدن کا چراغ جلتا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ انہوں نے مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. سردار جعفری کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری کب ملی؟

8. سردار جعفری کا انتقال کب ہوا؟

9. سردار جعفری کا پہلا مجموعہ کب منظرِ عام پر آیا اور اس کا کیا نام تھا؟

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. سردار جعفری کی حیات پر مختصر اُروشنی ڈالیے۔
2. سردار کی شاعری میں عورت کے تصور کو مثالوں سے واضح کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. علی سردار جعفری کی حیات وخدمات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. سردار کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے اور مثال میں اشعار پیش کیجیے۔

13.10 فرہنگ

خارجی	باہری	داخلی	اندرونی
تاثرات	تاثر کی جمع	وسعت	پھیلاؤ
مشیت ایزدی	قدرت کی طرف سے	مروّجہ	رائج، چلن میں
انحراف	انکار	طلسم	جادو
صوبتوں	پریشانیوں	تکریم	عزت کرنا
تہذیب	شائستگی، خوش اخلاقی	تمدن	طرزِ معاشرت
حکمت	دانائی، عقل مندی	دانش	علم وعقل
مہمل	بے کار، بے حودہ	تفسیر	وضاحت، تشریح
مخفی	چھپی ہوئی پوشیدہ	مستفید	فائدہ اٹھانا

13.11 معاون کتابیں

1. تین ترقی پسند شاعر : پروفیسر علی احمد فاطمی
2. سردار جعفری (فن اور شخصیت) : اصغر عباس
3. ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری : ڈاکٹر یعقوب یاور

13.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. 1937ء میں
2. 1940ء میں
3. سردار کی ادبی زندگی کا آغاز 15 سال کی عمر میں ہوا۔
4. 1938ء میں
5. ''خون کی لکیر'' 1949ء اور ''پتھر کی دیوار'' 1953ء
6. نظم ''نئی دنیا کو سلام''
7. 1986ء میں
8. یکم اگست 2000ء
9. 1943ء، پرواز

اکائی 11 : فیض احمد فیض

(نظم : صبحِ آزادی)

ساخت

14.1 اغراض ومقاصد
14.2 تمہید
14.3 فیض کی حیات
14.3.1 فیض کی شخصیت کی تعمیر
14.4 فیض کی شاعرانہ خصوصیات
14.5 فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کامتن
14.6 صبح آزادی کا خلاصہ
14.7 صبح آزادی کی تشریح
14.8 خلاصہ (اکائی کا)
14.9 نمونہ امتحانی سوالات
14.10 فرہنگ
14.11 معاون کتابیں
14.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

14.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ فیض کی نظم ''صبح آزادی''، فیض کی شاعری کی خصوصیات اور اُردو نظم کے بارے میں

مطالعہ کریں گے۔ اُردو ادب میں غزل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن دورِ جدید میں نظم ایک اہم صنف سخن کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں رونما ہونے والے حالات و حادثات کو یہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

14.2 تمہید

اُردو نظم کی داغ بیل دکن میں پڑی۔ قدیم اُردو شاعری میں نظم کا لفظ غزل کے علاوہ تمام صنفِ شاعری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے نظم کو اس کی ہیئت (Form) کے لحاظ سے پہچانا جاتا تھا۔ نظم کے قدیم وجدید سرمایہ پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا دامن رنگا رنگ اور متنوع مضامین سے مالا مال ہے۔ اس میں فکر وفلسفہ مناظرِ قدرت کا بیان، موسموں، تہواروں، پرندوں اور عمارتوں کا ذکر۔ سیاسی، سماجی، معاشی ومعاشرتی خیالات کی ترجمانی۔ تاریخی واقعات کا ذکر، غرض حیات وکائنات کے تمام گوشے خوش اسلوبی سے نظم ہوتے ہیں۔

1857ء کے بعد سے بھی نظم کا دامن وسیع ہورہا تھا۔ لیکن ترقی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل پڑنے کے بعد نظم میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگے۔ فیض چونکہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس لیے فیض کے یہاں بھی سارے مضامین نظم میں جگہ پاتے ہیں۔ نظم ''صبح آزادی'' دراصل آزادی کا مرثیہ ہے۔ کیوں کہ آزادی کا وہ خواب جو فیض نے دیکھا تھا۔ آزادی کے بعد پورا نہ ہوسکا۔ ان کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ نظم اس وقت کے تلخ حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔

14.3 فیض کی حیات

علامہ اقبال کے بعد سیالکوٹ کی سرزمین پر پیدا ہونے والے شاعر فیض ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ فیض کی پیدائش سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قدار میں 13 فروری 1911ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد سلطان محمد اپنے وقت کے مشہور بیرسٹر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ فیض کا بچپن بہت عیش میں گزرا لیکن والد کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فیض کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق فیض کی ابتدائی تعلیم درس قرآن سے شروع ہوئی۔ اسکولوں کی تعلیم کے دوران ابتدائی درجات امتیازات سے پاس کیے۔ میٹرک کے بعد بھی تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1919ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے انٹر، 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور پھر عربی میں بی۔اے آنرز کیا۔ 1933ء میں انگریزی میں ایم۔اے اور 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ مولوی میر حسن سے فارسی اور عربی میں دستگاہ حاصل کی۔ پطرس بخاری' پروفیسر لینگ ہارن اور صوفی غلام مصطفیٰ فیضؔ کے استاد تھے۔ فیض نے اپنے اساتذہ کی محفلوں میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا۔ فیض نے کلاس کی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ فیض کے مطابق ''انہوں نے کلاس سے زیادہ پطرس بخاری اور صوفی تبسم کی محفلوں سے استفادہ کیا اور علم حاصل کیا۔ (عمر گذشتہ کی کتاب۔ صفحہ 37-38)

فیض اپنی قابلیت' نرم مزاجی اور شیریں گفتاری کی وجہ سے اپنے دوستوں میں بہت مشہور تھے۔ ان کی قابلیت کی وجہ بچپن سے گہرا مطالعہ ہے۔ شخصیت مزاج اور کردار کو تابناک بنانے میں ان کے گھر والوں کا ہاتھ تھا۔

فیض نے ایک انگریز خاتون ایلس جارج سے اسلامی شرع کے مطابق شادی کی۔ ایلس ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ فیض کے دورانِ اسیری جس ہمت سے انہوں نے مشکلات کا سامنا کیا' فیض اور بچوں سے اپنی بے پناہ محبت اور مادرانہ شفقت کا ثبوت دیا یقیناً ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔ ایلس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایثار و وفا اور محبت و قربانی کا جذبہ نہ صرف مشرقی روایات ہیں بلکہ عورت کی سیرت کا حصہ ہیں۔

فیض کی عملی زندگی کا آغاز تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد 1935ء سے ہوتا ہے جب مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں ان کا تقرر بحیثیت انگریزی لکچرار ہوا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ کساد بازاری اور کشمکش سے بھرا ہوا زمانہ تھا۔ ایسے ہی وقت میں فیض کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے شوہر محمود الظفر سے ہوئی۔ مارکس کے منشور کے مطابق اور اردگرد کے ماحول اور حالات نے فیض کی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے بعد 1936ء میں ترقی

پسند ادبی تحریک سے وابستگی نے ان کی شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔فیض ترقی پسند تحریک کی ہر کانفرنس میں شریک ہوتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم میں جب فسطائی طاقتوں نے یورپ کے ممالک پر قبضہ جمانے کا ارادہ کیا اور اس ارادہ کے تحت انہوں نے روس اور انگلینڈ کو نشانہ بنایا تو لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر روس اور انگلینڈ کی اس لڑائی میں شکست ہوتی ہے تو اس سے ہندوستان کی آزادی بھی خطرہ میں پڑسکتی ہے۔لہٰذا بہت سے امن وانسانیت پسند ادیب و شاعر اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لینے کے لیے انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔فیض بھی اس جنگ میں عملی طور پر حصہ لینے کے لیے تیار ہو گئے اور انہوں نے کالج کی پرسکون زندگی کو خیر آباد کہہ دیا۔فوج میں بھرتی ہو کر استاد فیض کیپٹن فیض بن گئے اور فسطائی طاقتوں سے لڑنے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔فوج میں بہترین کارکردگی کے لیے 1946ء میں حکومتِ برطانیہ نے انہیں ایم۔بی۔ای کے خطاب سے نوازا۔آزادی کے بعد فوج کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور انگریزی روزنامہ ''Pakistan Times'' کے چیف ایڈیٹر ہو کر دہلی سے لاہور واپس چلے گئے۔اس کے بعد امروز اُردو اور ہفت روزہ لیل ونہار کے چیف ایڈیٹر کی خدمات بھی انجام دیں۔

فیض جنہوں نے ملک کی آزادی اور امن وآشتی کے لیے اپنی لکچرار کی پرسکون زندگی پر فوج کی زندگی کو ترجیح دی تھی ملک کی آزادی سے خوش اور تقسیم سے بے حد متفکر اور متاثر ہوئے۔ان کے فوج میں جانے کا مقصد ہی فوت ہو گیا تھا۔تقسیم کے لیے اپنی ناخوشی کا اظہار انہوں نے اپنی نظم صبح آزادی میں کیا۔

فیض کی زندگی میں راولپنڈی سازش کیس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔9مارچ 1951ء کو جنرل ایوب خاں کی سرکار کا تختہ الٹنے کی سازش میں فیض کو سجاد ظہیر اور دوسرے سیاسی لیڈروں اور فوجی افسروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔فیض کو سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں رکھا گیا۔انہیں قیدِ تنہائی کے دن بھی گزارنے پڑے۔فیض کی بہت سی خوبصورت اور معرکہ کی نظمیں قید کے زمانے کی یادگار ہیں۔ان کے یہ اشعار جن میں تلخیٔ حیات اور تلخیٔ کلام کا احساس ہوتا ہے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر اک حلقہَ زنجیر میں زباں میں نے''

20 اپریل 1955ء کو فیض جیل سے رہا ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے مختلف ممالک کے دورے بھی کیے۔ افریقہ اور ایشیا میں ادیبوں کی ہونے والی کانفرنس میں فیض نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔ دسمبر 1958ء میں پاکستان میں ایوب خان کا مارشل لا نافذ ہو چکا تھا اور فیض کو ایک بار پھر سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ یکم اپریل 1959ء کو فیض جیل سے رہا ہوئے۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر ہیں جنہیں لینن امن پرائز 1961ء میں ماسکو میں دیا گیا۔ 1973ء میں سجاد ظہیر کے انتقال سے فیض کو گہرا صدمہ پہنچا۔ فیض قیامِ بیروت کے دوران وہاں سے نکلنے والے میگزین لوٹس کے مدیر بھی رہے۔

فیض ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنہیں ان کی زندگی میں ہی عالمگیر پیمانے پر شہرت مل چکی تھی۔ ان کی زندگی میں ہی نہ صرف ہندوستان کے لکھنؤ، بھوپال، الٰہ آباد، ممبئی وغیرہ شہروں میں ان پر سمینار وغیرہ ہوئے بلکہ لندن یونیورسٹی میں بھی ان پر سمینار ہوا۔ اس سمینار میں بذاتِ خود شرکت کی۔ فیض کی تقریباً 15 شعری ونثری تخلیقات شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

فیض نہ صرف شاعر تھے بلکہ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار اور نثر نگار بھی تھے۔ اُنہوں نے دو فلموں کے مکالمے اور گانے بھی لکھے۔

اس انسان دوست اور حبِ وطن شاعر کی شمعِ حیات 20 نومبر 1984ء کو لاہور کے میڈیکل کالج میں گل ہوگئی اور ان کی بے چین روح کو ابدی سکون مل گیا۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں حفیظ جالندھری کے مزار کے قریب ان کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

14.3.1 فیض کی شخصیت کی تعمیر

فیض کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے گردوپیش کے ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنے اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئے۔ پھر انقلابِ روس نے ان کے دل ودماغ پر اپنے اثرات مرتسم کیے۔ اس کے علاوہ جوش، چکبست، ساغر، حفیظ، سیماب وغیرہ کی شاعری اور ملک وقوم کی خدمات سے متاثر ہوئے۔ 1933ء میں جرمن میں ہٹلر نے تباہ و بربادی کی اور تہذیب وتمدن پر گہرا حملہ کیا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی اور دوسری جنگِ عظیم کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ لوگوں میں فاشزم کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا اثر فیض پر بھی پڑا۔

اسی زمانے میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم طلبا کا ایک گروہ جس میں سردار جعفری، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ تھے اشتراکیت کی طرف مائل ہوئے۔ کالج کی ملازمت کے زمانے میں پروفیسر محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں سے ملاقات اور اس کے ساتھ ہی کارل مارکس کے منشور کا گہرائی سے مطالعے نے ان کی دنیائے شاعری میں نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔ اس کے ساتھ ہی فیض اس وقت کے حالات اور ماحول سے بھی بہت متاثر ہوئے۔

یہی وہ حالات تھے جنھوں نے فیض کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔ اس سے ان کی شاعری متاثر ہوئی۔ ایسی شاعری جس نے رفتہ رفتہ اشتراکیت کی راہ اپنا کر اسے اپنی شاعری کا بنیادی فلسفہ بنالیا۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے:

1. اُردو نظم کی داغ بیل کہاں پڑی؟
2. فیض کو لینن امن پرائز کب اور کہاں ملا؟
3. فیض کی شخصیت کی تعمیر میں کس کا اہم رول رہا؟

14.4 فیض کی شاعرانہ خصوصیات

اُردو شاعری میں فیض کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے

شاعری کا سفر آگے بڑھتا ہے رومانی عناصر کم ہونے لگتے ہیں اوراس کی جگہ اشتراکیت' سماجی وسیاسی شعور' انقلابیت اور حب الوطنی جیسے خیالات جگہ پانے لگتے ہیں۔ اور کلام میں پختگی آتی جاتی ہے۔

پہلا مجموعہ 'نقشِ فریادی' جو 1941ء میں منظرِ عام پر آیا دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رومانی اور دوسرے حصے میں رومانی اور نیم اشتراکی نظمیں شامل ہیں۔ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی نظمیں اساتذہ کے کلام سے متاثر ہو کر تخلیق ہوئی ہیں۔ 35-1934ء میں عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی ماحول نے ان کی فکر کو ایک نیا رخ دے دیا۔ نظم 'یاس' اور 'مرے ندیم' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ رومان سے اشتراک کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کی شاعری پر تذبذب اور کشمکش کی فضا چھائی رہتی ہے اور یادِ محبوب باقی رہتی ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی کارل مارکس کے مینی فسٹو کے گہرائی سے مطالعہ' سجاد ظہیر اور رشید جہاں کی انقلابی صحبتوں نے فیض کے شعری رجحان کو متاثر کیا اور فیض پکار اٹھے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

....

اور بھی دکھ ہیں زمانہ میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی وصل کی راحت کے سوا

یوں شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جہاں فیض کا تخلیقی سفر بے پناہ انقلابی تبدیلیوں سے ہم کنار ہو کر وقت اور عہد کے تقاضے کو پورا کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ نقشِ فریادی کے دوسرے حصے کی شاعری اس کا ثبوت ہے۔ فیض کی شاعری کا یہی وہ تاریخی موڑ ہے جب انہوں نے اپنی معرکہ آرا غزل 'دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے' تخلیق کی۔ رقیب سے تنہائی' کتے' بول وغیرہ نظمیں ان کے بدلتے ہوئے موڈ کی عکاسی کرتی ہیں۔ نظم 'سوچ' میں بدلتے ہوئے رجحان کا برملا اظہار ملتا ہے۔ دوسرے انقلابی شاعروں کی مانند فیض کی شاعری میں انقلاب کی گھن گرج نہیں ہے۔ اس کی مثال نظم 'بول' ہے جس میں اشاروں کے ذریعہ بات کی گئی ہے۔

فیض کے اس دور کی شاعری میں رومان سے حقیقت اور پھر حقیقت سے رومان کی طرف قدم بڑھانے کا عمل صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ فیض کی اشتراکیت کے سلسلے میں محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''فیض کے یہاں اشتراکیت ایک فکر دل پسند ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں کا خمیر اٹھاتی ہے۔''

دستِ صبا تک پہنچتے پہنچتے فیض کے سیاسی شعور میں پختگی آ جاتی ہے۔ یہ زمانہ تاریخی اعتبار سے تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ فیض پر بھی ان تبدیلیوں کے اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اور پھر 1947ء میں ہندوستان کی آزادی، ملک کا بٹوارہ اور قتل و غارت گری نے فیض کو بے پناہ متاثر کیا۔ آزادی کا یہ متوالا آزادی کی صبح کو داغ دار کہنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

دستِ صبا کا زیادہ تر کلام قید کے زمانے میں لکھا گیا ہے اسی لیے شاعری پر زنداں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ قطعہ جو فیض نے بہ زمانۂ قید لکھا ہے ان کے بلند حوصلے کا غماز ہے۔ جہاں ماتم نہیں بلکہ لوگوں کو بیدار کرنے کا جذبہ ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر اک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس عہد کی غزلیں بھی انسانی ہمدردی، آزادی، سماج اور ملک میں ایک عمدہ نظامِ حکومت قائم کرنے اور انقلاب پیدا کر دینے کے جذبے سے بھری ہوئی ہیں۔

اس طرح دستِ صبا کا شعری سرمایہ ان کے پختہ سیاسی شعور و فکر و خیال کی بلندی، عوام سے قربت، مضبوط نظریۂ اشتراکیت اور فکر کی عالمگیریت کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ فیض پوری دنیا کے عوام کے ہر دلعزیز شاعر بن کر

ابھرتے ہیں اورایک راہ پا کراپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

فیض کی شاعری کا یہ سفر آگے بڑھتے ہوئے زنداں نامہ اور دست تہہ سنگ کی منزلوں تک پہنچتا ہے۔اس عہد کی شاعری رومانی' سیاسی اوراشترا کی نقطۂ نظر کی حامل ہے۔کہیں کہیں اشترا کیت اور رومان کا ملا جلا ماحول بھی پایا جاتا ہے۔

شاعری کی اس منزل پر پہنچتے پہنچتے فیض کی فکریں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔شاعری کا سیاسی وسماجی شعور پختہ ہوکراور بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔اس کے ساتھ ہی زنداں کے آلام ومصائب نے انہیں غریبوں کے دکھ درد سے اور بھی قریب کر دیا۔لیکن شاعری کی اس منزل پر پہنچ کر بھی وہ رومانیت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔حالانکہ وہ رومانیت جونقشِ فریادی اوردستِ صبا کا خاصہ تھی ان مجموعوں میں نہیں ملتی۔

فیض نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری قوم کے لیے اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف جو جنگ لڑی ہے وہ قابلِ غور ہے۔اس عہد کی غزلیں بڑی عمدہ اور معیاری ہیں۔روایتی علامتیں اور استعارے نئے معانی ومفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔غزلیں اس وقت کے حالات وواقعات اور مسائل وماحول کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس سے اس وقت کا معاشرہ دوچار تھا۔کچھ غزلوں کا مواد سیاسی ہے تو کچھ میں تلخیٔ حیات اور تلخیٔ روزگار کوموضوع بنایا گیا ہے۔

لب پر ہے تلخی مئے ایام ورنہ فیض
ہم تلخی کلام پر مائل ذرا نہ تھے

غرض کہ فیض کی نظمیں اورغزلیں' سیاسی ہوں یا نیم سیاسی' رومانی ہوں یا نیم رومانی اوراشترا کی ہوں یا نیم اشترا کی ان کا اشترا کی نقطۂ نظر بڑی کامیابی سے نظم ہوا ہے۔

آخری عہد کی شاعری بھی اپنے اردگرد کے ماحول اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے حالات سے متاثر ہوکر وجود میں آتی ہے۔انسانیت پر کامل یقین فیض کی آخری دور کی شاعری میں بھی موجود ہے۔فیض کی نظریں بین الاقوامی مسائل پر بھی تھیں۔اس لیے دنیا بھر کے دکھی عوام ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔اپنے اس جذبے کے تحت

فیض بین الاقوامی سطح پرشہرت سے ہمکنار ہوئے۔

فیض کی بین الاقوامی سطح پر اشتراکی نظریہ کی وسعت و ہمہ گیری کی دلیل ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں انہوں نے قومی سطح سے اوپر اٹھ کر بین الاقوامی سطح کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔اس میں فلسطین، ایرانی طلبہ اور بنگلہ دیش، بیروت وغیرہ پر نظمیں شامل ہیں۔

اس دور کی غزلوں کا اندازِ بیان کلاسیکی ضرور ہے لیکن اس میں خاصہ نیا پن موجود ہے۔ان کی غزلوں کی فضا نظموں کی فضا سے مناسبت رکھتی ہے۔جوافسردگی اور درماندگی ان کی نظموں میں ملتی ہے وہی ان کی غزلوں کا بھی خاصہ ہے۔لیکن اس کے باوجود فیض محبوب کے دامِ محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔لیکن اشعار میں کہیں کہیں غمِ حیات اور غمِ زمانہ کے درد کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

فیض نے ملک وملت، نسل ورنگ کے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر شاعری کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت نہ صرف ملک گیر ہے بلکہ عالمگیر ہے۔ان کے یہاں ساری انسانیت کا دکھ درد اپنی بلند سطح پر ملتا ہے۔درد کا رشتہ وہ رشتہ ہے جو ان کی شاعری کے ہر دور میں جلوہ فگن رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی بے قصور عوام کو نشانہ بنایا گیا فیض خاموش نہیں رہے بلکہ پُر اثر نظمیں کہنے میں کامیاب ہو گئے۔

فیض کی شاعری میں سیاست اور انسانیت شیر وشکر ہو کر کچھ اس طرح اشتراکیت کی شکل اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسان اور انسانیت سے سچی محبت فیض کو بین الاقوامی شاعر بناتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کے شعرا میں فیض کو جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ کسی اور شاعر کا حصہ نہیں۔ہم فیض کی شاعری کی خصوصیات کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

-1	رومانی شاعری	-2	انقلابی شاعری
-3	اشتراکی شاعری	-4	رومانی اشتراکی شاعری

-5 سیاسی شاعری -6 نیم سیاسی شاعری

-7 بین الاقوامی سطح کی شاعری

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. فیض کی فکر کو نیا رخ کب ملتا ہے؟

5. فیض کی انقلابی شاعری میں گھن گرج ہے یا نہیں؟

6. فیض کا کوئی شعر لکھیے جس میں تلخیٔ حیات اور تلخیٔ زمانہ کا ذکر ہو۔

14.5 فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' کا متن

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دست میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غمِ دل
جو ان لہو کی پراسرار شاہ راہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کسی پر چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

14.6 صبح آزادی کا خلاصہ

ایک لمبی لڑائی اور بہت سی جانوں کی قیمت چکانے کے بعد ہندوستان 15 اگست 1947ء کو آزاد تو ہوا لیکن دو حصوں میں تقسیم ہو کر۔ فیض جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے فوج کی نوکری کی تھی اور آزادی کا جو خوبصورت

خواب دیکھا تھا' ان کے خوابوں کا شیزارہ بکھر گیا۔ ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ خون کی ہولی کھیلی گئی۔ بربریت کی ننگ تصویر سے فیض بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے انہیں احساسات کی ترجمانی اس نظم ''صبح آزادی'' میں کی ہے جو اُن کے مجموعہ کلام دستِ صبا میں شامل ہے۔

ہندوستان میں آزادی کا اجالا داغدار بن کر پھیلا۔ جس خوشنما صبح کی توقع آزادی سے متوقع تھی یہ وہ صبح نہیں تھی۔ یہ وہ صبح نہیں تھی جس کی خواہش میں لوگوں نے دار ورسن کی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ آزادی کے بعد ملک میں نفرتوں کا چراغ گل ہوجانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ کچھ شر پسندوں نے فرقہ واریت کی آگ میں ملک کے عوام کو جلا ڈالا۔ ابھی معاشرہ میں آزادی سے پہلے والا ماحول موجود ہے۔ اس لیے فیض یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ:

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

یعنی ہم نے جس منزل کی خواہش کی تھی وہ منزل ابھی نہیں آئی ہے۔ ہمیں مزید جدوجہد کرنی ہے۔

14.7 صبح آزادی کی تشریح

یہ داغ داغ..................ابھی نہیں آئی

فیض اور دوسرے ہندوستانی رہنماؤں نے آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ ان کا یہ خواب 15 اگست 1947ء کو مکمل تو ہوا لیکن ہندوستان کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کی شکل میں۔ سالہا سال کی غلامی کے بعد ملک کو آزادی نصیب ہوئی لیکن جس آزادی کا انتظار تھا یہ وہ آزادی نہیں تھی۔ ہندوستان میں آزادی کا اجالا پھیلا لیکن داغ داغ تھا۔ یہ اجالا رات کی سیاہی کا ڈسا ہوا تھا۔ آزادی صبح کاذب کی مانند آئی۔ یہ وہ سحر' یہ وہ آزادی نہیں جس کی ہم نے (یا کم از کم فیض نے) آرزو کی تھی۔ جس کے لیے اتنی جدوجہد کی تھی۔ یہ وہ سحر نہیں جس کی خواہش میں لوگوں نے اپنی جانوں کی بازیاں لگادی تھیں۔ جامِ شہادت پیا تھا۔ اور جیلوں کی سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے قیمتی وقت گنوادیے تھے۔ آزادی کی آرزو میں ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ اس امید پر کہ صبح کاذب کے بعد صبح صادق ہوگئی۔ اور جو نیا سورج طلوع ہوگا وہ ہمارے لیے ایک نئے نظام کی خوش خبری لے کر آئے گا۔ ہم نے سرمایہ داروں اور انگریز

حکمرانوں کے ظلم و جبر اسی لیے برداشت کیے تھے کہ کہیں تو اس ظلم و جبر کا خاتمہ ہوگا۔ تاروں کی آخری منزل میں کبھی تو سست رفتار سے چلنے والی رات ساحل سے جا لگے گی۔ یعنی کبھی تو اس سیہ رات کا خاتمہ ہوگا۔ غموں کا سفینہ آئے گا اور لوگوں کو غموں سے نجات ملے گی۔

شاعر کو وہ وقت بھی یاد ہے جب وہ آزادی کی لڑائی میں شریک ہونے کے لیے سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکل پڑا تھا۔ آگے اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ہم اس معرکہ میں قدم رکھنے کے لیے آگے بڑھے تو ہمارے دامن پر نہ جانے کتنے ہاتھ پڑے کیوں کہ ہم اس شاہراہ سے ہو کر گزر رہے تھے جہاں بے صبر خواب گاہوں میں حسن کی دیویاں بلاتی ہیں۔ لیکن ہم آزادی کے متوالے تھے۔ ہم پر ان سب باتوں کا اثر کہاں ہوتا ہے۔ ہم ان سب چیزوں سے بے خبر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے کیونکہ ہمیں تو آزادی عزیز تھی۔ ہمیں تو اس صبح کا انتظار تھا جب آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور جگر کی آگ، نظر کی امنگ اور دل کی جلن کو راحت ملے گی۔ میں نے آزادی کے لیے اپنی تمناؤں کا خون کیا اور بدن کے بلانے اور بانہوں کے پکارنے پر دھیان نہیں دیا۔ ہجر کے درد کو سہا۔ راستے میں آنے والی ان تمام رکاوٹوں کو پار کیا جو آگے جانے سے ہمارے قدم کو روک رہی تھیں۔ کیونکہ ہم اس سحر کے، اس صبح کے دیکھنے کے تمنائی تھے جس میں سبھی انسانوں کو مساوات کا درجہ ملے گا۔ طبقاتی تفریق سے معاشرہ آزاد ہوگا۔ کوئی غریبوں کی محنت کا مذاق نہ اڑا سکے گا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد یہ سب کچھ تو نہیں ہوا۔ ہاں لوگوں کے اندر وحشیانہ جذبے نے ضرور جنم لے لیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اور آزادی ملنے پر خون کی ہولی کھیلی گئی۔

فیض کہتے ہیں کہ آزادی کس انداز سے آئی۔ ہم آزادی کے متوالوں کو اس کی کچھ خبر بھی نہیں۔ جگر کی آگ، نظر کی امنگ اور دل کی جلن ان سب چیزوں پر ہمیں ابھی تک قابو نہیں ہو سکا ہے۔ یعنی معاشرہ میں ابھی آزادی سے پہلے والا ماحول موجود ہے۔ ابھی شب کی گرانی میں کمی نہیں آئی ہے۔ ابھی وہ گھڑی نہیں آئی ہے جس میں ہمیں معاشرہ کی تمام برائیوں سے نجات مل جائے۔ اسی لیے شاعر ایسی آزادی کی خاطر، جس کی وہ تمنا کرتا ہے اس منزل کی طرف آگے بڑھنے کو کہتا ہے تا کہ آگے جا کر کہیں نہ کہیں اس کو وہ منزل مل جائے جس کی اس نے تمنا کی تھی۔

فیض کی یہ نظم اپنے عہد کا وہ منظر نامہ پیش کرتی ہے جو اس وقت کے نظام میں موجود تھا۔ اور وقت کے تلخ حقائق سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ یہ نظم فیض کے سیاسی وطبقاتی شعور کی آئینہ دار ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. آزادی کی خاص بات کیا تھی؟

8. کیا فیضؔ کی نظم اپنے عہد کا منظر نامہ ہے؟

9. فیض کی نظم ان کے کس رجحان کا پتہ دیتی ہے؟

14.8 خلاصہ (اکائی کا)

نظم کے قدیم وجدید سرمایہ پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا دامن رنگا رنگ اور متنوع مضامین سے مالا مال ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل پڑنے کے بعد نظم میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔ فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس لیے فیض کے یہاں بھی سارے مضامین نظم میں جگہ پاتے ہیں۔

فیض کی پیدائش سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قدار میں 13 فروری 1911ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد سلطان محمد اپنے وقت کے مشہور بیرسٹر، اور علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ فیض کا بچپن بہت عیش میں گزرا لیکن والد کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ فیضؔ نے ایک انگریز خاتون ایلس جارج سے اسلامی شرع کے مطابق شادی کی۔ فیض کی عملی زندگی کا آغاز تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد 1935ء سے ہوتا ہے جب مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں ان کا تقرر بحیثیت انگریزی لکچرار ہوا۔ لیکن پھر وہ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ فوج سے مستعفی ہوئے۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور خوب نام کمایا۔ ترقی پسند تحریک سے اُن کی شروع سے وابستگی رہی اور اپنی سیاسی دلچسپیوں کے باعث کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔

اُردو شاعری میں فیض کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی ہے۔ لیکن جیسے جیسے

شاعری کا سفر آگے بڑھتا ہے رومانی عناصر کم ہونے لگتے ہیں اور اس کی جگہ اشتراکیت، سماجی و سیاسی شعور، انقلابیت اور حب الوطنی جیسے خیالات جگہ پانے لگتے ہیں ۔ پہلا مجموعہ ''نقشِ فریادی'' 1941ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اُن کے دوسرے مجموعوں کے نام دستِ صبا، زنداں نامہ اور دست تہہ سنگ ہیں۔ فیض کی شاعری میں سیاست اور انسانیت شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ انسان اور انسانیت سے سچی محبت فیض کو بین الاقوامی شاعر بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے فیض اپنے عہد کے مقبول ترین شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ فیض کی شاعری کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مثلاً رومانی شاعری، انقلابی شاعری، اشتراکی شاعری، رومانی اشتراکی شاعری، سیاسی شاعری، نیم سیاسی شاعری اور بین الاقوامی سطح کی شاعری وغیرہ۔

نظم ''صبح آزادی'' فیض کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے جو اُن کے مجموعہ کلام دست صبا میں شامل ہے۔ یہ نظم دراصل آزادی کا مرثیہ ہے۔ کیوں کہ آزادی کا وہ خواب جو فیض نے دیکھا تھا۔ آزادی کے بعد پورا نہ ہو سکا۔ ان کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ نظم اس وقت کے تلخ حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔

14.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. فیض کے حالاتِ زندگی پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
2. دستِ صبا کی شاعری کا مختصراً جائزہ لیجیے۔
3. فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. فیض کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے دستِ صبا کی شاعری کا جائزہ لیجیے۔
2. کیا فیض کی نظم ''صبح آزادی'' اپنے عہد کا منظر نامہ ہے؟ نظم کے اشعار کے ساتھ دلائل دیجیے۔
3. فیض احمد فیض کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اُن کی نظم ''صبح آزادی'' کا خلاصہ لکھیے۔

14.10 فرہنگ

حادثہ	صدمہ، سانحہ، واقعہ	قدیم	پرانی
ہیئت	شکل	سرمایہ	پونجی، دولت
متنوع	طرح طرح کے	وسیع	پھیلنا، پھیلاؤ
دست گاہ	طاقت، قدرت، مہارت	استفادہ	فائدہ حاصل کرنا
تابناک	روشن، چمکیلا		
گل	بجھنا (ختم ہونا، مرجانا) پھول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔		
جسدخاکی	مٹی کا جسم	سپرد	سونپنا
بیدار	جگانا	جذبہ	ولولہ، جوش
متاع	پونجی	لوح	تختی
حلقہ	دائرہ، گولائی	آلام	رنج وغم
مصائب	مصیبت کی جمع	دوچار	جوجھنا
افسردگی	کمہلاہٹ، مرجھانا	خاصا	اچھائی
دامِ محبت	محبت کے جال میں	گزیدہ	ڈسا ہوا
فلک	آسمان	دست	ہاتھ، پوری شے
ساحل	کنارہ	سفینہ	کشتی یا جہاز
شاہ راہ	سڑک	پراسرار	بھید سے بھری
دیارِ حسن	محبوب کے شہر کا علاقہ	خواب گاہ	آرام کرنے کی جگہ
ہجراں	ہجر کی جمع (جدائی)	نگار	بات، محبوب

صبا	ہوا	گرانی	بھاری پن
دیدہ	آنکھ، دیکھا ہوا	بربریت	بے رحمی سے قتل کرنا
ننگ	ننگا	طلوع	نکلنا

صبح کاذب — جھوٹی صبح (صبح کی وہ روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے)

صبح صادق — (سچی صبح) نور کا تڑکا، پو پھٹے

14.11 معاون کتابیں

1. فیض احمد فیض : مرتبہ ضیا ساجد
2. فیضانِ فیض : ابوسعید قریشی
3. فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ : مرتبہ خلیق انجم
4. تخلیق وتنقید : امیر اللہ خاں شاہین
5. فیض احمد فیض۔ شخص اور شاعری : مرتبہ اطہر نبی

14.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اُردو نظم کی داغ بیل دکن میں پڑی۔
2. فیض کو امن پرائز 1961ء میں ماسکو میں ملا۔
3. اس وقت کے حالات اور کارل مارکس کے منشور کے مطالعہ نے اہم رول ادا کیا۔
4. 1934-35ء میں ان کی فکر کو ایک رخ ملتا ہے۔
5. فیض کی انقلابی شاعری میں گھن گرج نہیں ہے۔
6. متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

7. آزادی کی خاص بات یہ تھی کہ ملک دو حصوں، ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگیا۔

8. فیض کی نظم ''صبح آزادی'' اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتی ہے اور اس وقت کے تلخ حقائق سے بھی آگاہ کرتی ہے۔

9. فیض کی یہ نظم ان کے پختہ سیاسی، سماجی وطبقاتی رجحان کی آئینہ دار ہے۔

اکائی 12 : اختر الایمان

ساخت

15.1 اغراض ومقاصد

15.2 تمہید

15.3 اختر الایمان کی سوانح حیات

15.4 اختر الایمان کی تصانیف

15.5 اختر الایمان کی شعری خصوصیات

15.6 اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا''

15.7 ''ایک لڑکا'' کی تفہیم وتشریح

15.8 خلاصہ

15.9 نمونہ امتحانی سوالات

15.10 فرہنگ

15.11 معاون کتابیں

15.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

15.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم اُردو کے اہم نظم نگار شاعر اختر الایمان کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے اور اُن کی معروف نظم ''ایک لڑکا'' کا بھی مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ اختر الایمان کی حیات اور اُن کی شعری خدمات کے بارے میں بات چیت کرسکیں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو لکھ بھی

سکیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس نظم کو مکمل یا اس کا کچھ حصہ زبانی یاد کرلیں تا کہ کبھی کسی محفل میں اسے سنا سکیں۔ کبھی اس کے مصرعے یا اشعار سے اپنی گفتگو کو جاندار بنا سکیں۔

15.2 تمہید

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں مغربی ادب کے زیرِ اثر اردو شعر و ادب میں جدیدیت کو کافی فروغ ملا، جس کے پس منظر میں صنعتی ترقی اور صنعتی شہروں کے مسائل تھے۔ اس رجحان کے تحت نظم لکھنے والوں میں اختر الایمان، مجید امجد، افتخار جالب اور ناصر کاظمی وغیرہ اہم ہیں۔ نیز آج کل کے اہم نظم نگار شعرا مخمور سعیدی، عزیز قیسی، قاضی سلیم، منیر نیازی، بلراج کومل، عمیق حنفی، شہریار، کمار پاشی، ساقی فاروقی اور شکیل اعظمی وغیرہ ہیں۔ اور آج جدید اُردو نظم اردو ادب کی ایک توانا صنف سخن کی حیثیت سے ترقی کر رہی ہے۔

آج ہم جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھنے والے ایک اہم شاعر اختر الایمان کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

15.3 اختر الایمان کی سوانح حیات

اختر الایمان 12 نومبر 1915ء کو اتر پردیش کے ضلع بجنور کے قصبہ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بہت ہی عسرت اور تنگدستی میں گزرا۔ انہوں نے 1937ء میں میٹرک، طرح طرح کے درپیش مسائل زندگی کے باوجود، ادبی، تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے 1942ء میں اینگلو عربک کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج، دہلی) سے گریجویشن اور 1944ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کا سالِ اول مکمل کیا۔ اس دوران انہوں نے کبھی کلرکی اختیار کی، کبھی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور ایک مختصر عرصے کے لیے ماہنامہ ''ایشیا'' (میرٹھ) کی ادارت بھی کی، بالآخر فلم کے شعبہ قلم کار سے وابستہ ہوگئے۔ انہیں ''فلم فیئر ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ فلموں کے لیے منظرنامے اور مکالمے لکھنے کے علاوہ انہوں نے ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی لیکن اپنی نظموں کو مادی ترقی اور حصولِ آسائش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ فلموں سے دیگر مادی فوائد کے علاوہ، بقول اختر الایمان انہیں

''بصیرت''، ملی اور انسان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ اس ''بصیرت'' کو ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں اور دور دراز کے ملکوں کی سیاحت نے مزید جلا بخشی۔ انہوں نے مشاعروں، سمیناروں، کانفرنسوں اور فلموں کے سلسلے میں بیروت، دمشق، لندن، پیرس، قاہرہ، جرمنی، نیویارک، لاس اینجلز، سان فرانسسکو، شکاگو، کینیا، یوگینڈا، تنزانیہ، نیروبی، فرینکفرڈ، دوبئی، کراچی، الغرض دنیا کے بے شمار ممالک کی سیاحت کی۔ 1995ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

اختر الایمان تاحیات کسی خاص سیاسی، معاشرتی اور ادبی نظریے، گروہ یا تنظیم سے وابستہ نہیں رہے۔ گرچہ ان کے عہد میں وابستگی کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی تھی۔ غیر وابستگی کے باوجود، محض اپنی تخلیقات کے بل پر، دیر سے سہی، ادبی حلقوں میں انہیں پذیرائی نصیب ہوئی۔ نظریاتی غیر وابستگی اور ادب و نظریے کو وسیلہ ظفریابی نہ تصور کرنے کے باوجود انہیں یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، میرا اکادمی نے انعامات اور حکومتِ مدھیہ پردیش نے ''اقبال سمان'' سے نوازا اور تین بار ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' کے لیے بھی ان کا نام تجویز کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. اختر الایمان کی تاریخ پیدائش اور سن وفات لکھیے۔
2. اختر الایمان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کن کن انعامات و ایوارڈ سے نوازا گیا؟
3. اختر الایمان کو فلم کا کون سا بڑا ایوارڈ ملا؟

15.4 اختر الایمان کی تصانیف

مجموعہ: گرداب (مطبوعہ 1943ء)

مجموعہ: سب رنگ (مطبوعہ 1946ء)

مجموعہ: تاریک سیارہ (مطبوعہ 1952ء)

مجموعہ: آبِ جو (مطبوعہ 1959ء)

مجموعہ: یادیں (مطبوعہ 1960ء)

مجموعہ: بنت لمحات (مطبوعہ 1969ء)

مجموعہ: نیا آہنگ (مطبوعہ 1977ء)

مجموعہ: سروساماں (مطبوعہ 1983ء)

مجموعہ: زمین زمین (مطبوعہ 1990ء)

مجموعہ: زمستاں سردمہری کا (مطبوعہ 1997ء، پس ازمرگ)

نثری خودنوشت ''اس آبادخرابے میں'' (مطبوعہ 1996ء)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. اختر الایمان کا کون سا مجموعہ کلام 1960ء میں شائع ہوا؟

5. اختر الایمان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے ان کے مجموعہ کلام کا نام بتائیے۔

6. اختر الایمان کی خودنوشت کب اور کس عنوان کے تحت شائع ہوئی؟

15.5 اختر الایمان کی شعری خصوصیات

اختر الایمان کی زیادہ تر نظمیں زندگی کے اہم اور سنجیدہ مسائل سے فلسفیانہ انداز میں رشتہ استوار کرتی ہیں۔ مثلاً فراموش گاری، مسئلہ وجود وعدم، جہد للبقاء، جہد للصلح، ضمیرِ انسانی، زوالِ آدم خاکی، انحطاطِ انسانیت، نیکی اور بدی کی کشمکش، خارج وباطن کی آویزش، حقیقت وخواب کی جدوجہد، آزادی اور غلامی کا تفاوت وغیرہ۔ انہوں نے وقت اور اس کی ناگزیریت، جیسے خالص فلسفیانہ موضوع کو شعری قالب عطا کرنے کے علاوہ معاشرتی مسائل: قدروں کی زبوں حالی، سیاست کی ایذارسانی، دم توڑتی دنیا کی کراہیں، حبِ انسانی، نئے نظامِ زندگی کی تلاش، ان کے غور وفکر کے خاص نکات ہیں۔ کائنات کے اسرار ورموز سے نقاب کشائی کرتی ہوئی، بعض نظموں میں تلاش وجستجو کا انداز بھی ملتا ہے۔

اختر الایمان کی بیشتر نظمیں انسان دوستی پر مبنی ہیں ۔ یہاں تک کہ ابتدائی دور کی نظمیں ''تاریک سیارہ'' اور ''خاک وخون'' نئی اور اعلیٰ انسانیت کا مژدہ سناتی ہیں۔ ''محبت'' جذبۂ محبت کی جاودانی اور اس کی ہمہ جہتی کی تائید کرتی ہے۔ ''ایک لڑکا'' ضمیرِ انسانی کی بیداری کا استعارہ ہے۔ شاہ کار نظم ''مفاہمت'' انسان کی دو بنیادی کیفیات، خوشی اور غم کے اسباب کی تحقیق اور حل پیش کرتی ہے۔ ''حمام بادگرد''، ''میں-ایک سیارہ'' اور ''میرا دوست-بوالہوال'' گولہ بارود، میزائل اور بین الاقوامی دہشت گردی پر اظہارِ افسوس ہے۔ انسان کی بداعمالی کے سبب ''ارضِ ناکس'' میں زمین کا کرب موضوع بنتا ہے۔ انسان کی حیوانیت، وحشت اور فسادات کی نفی کرتی ہے: ''راہِ فرار'' اور ''رام راج بجنور میں''۔ ''یادیں'' عہدِ حاضر کی آفاقی داستانِ غم ہے۔ صبح کی چائے کے ساتھ قتل وغارت گری کی خبریں ہضم کرنے والے انسان کی کہانی ہے ''شیشہ کا آدمی''۔ آج کے شہروں کے کرب کو احاطۂ فکر میں لاتی ہیں ''عروس البلاد'' اور ''نیا شہر''۔ عہدِ حاضر کے کئی خانوں میں بٹے ہوئے انسان، جو ایک اعتبار سے ''سیزوفرینیا'' کا مریض بن چکا ہے، کے فکری انتشار کو ظاہر کرنے والی شاہ کار تخلیق ہے ''اپاہج گاڑی کا آدمی''۔ ''سحر''، ''وقت کی کہانی'' اور ''عہدِ وفا'' میں وقت کی چیرہ دستیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''زمستان سرد مہری کا'' اور ''کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام'' وقت کے فلسفیانہ فکر کا شعری اظہار ہے۔ ''مسجد'' اور ''پرانی فصیل'' قدروں کی شکست وریخت کا نوحہ ہیں۔ ''بنت لمحات'' لوٹ کر واپس نہ آنے والے لمحوں اور یادوں کی شگفتہ پیش کش ہے۔ مختصراً اختر الایمان کی نظمیں، ایک عام انسان کی حیثیت سے دنیا بسر کرنے میں پیش آئے تلخ تجربات، تکلیف دہ مشاہدات، اور کربناک تاثرات پر منحصر ہیں۔ ان تکلیف دہ احساسات اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار کے سبب ان کی اکثر نظمیں نغمگی اور طمانینت سے کنارہ کشی کر کے، کھردرے اور ناہموار اظہار اور منتشر ہیئت، مگر متوازن انداز اور پرسکون، فکری لب و لہجے کو اپنا وسیلہ بناتی ہیں۔

اختر الایمان ادب میں نظریاتی وابستگی، روایتی رومانیت، چہار صد سالہ غزلیہ فضا اور برسوں پرانے شعری لوازمات کے مخالف تھے۔ تاہم ان کی ابتدائی نظموں میں رومانیت کی گھٹتی بڑھتی پرچھائیاں، تغزل، کلاسیکی انداز، نیز

ماقبل کے معروف ومقبول شعرا کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، جو بتدریج کم ہوتے ہوتے، مفقود ہو گئے۔اس ارتقائی مراحل سے گزرکر، بالآخر اختر الایمان، اپنی نئی شعریات اوراپنا منفرد اسلوب وضع کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کا یہ مخصوص اسلوب، ان کی نظموں کے تلخ وترش موضوعات کے مانند کھردرا اور ناہموار مگر بامعنی ہے۔

اختر الایمان نے اپنی ابتدائی نظموں میں علامتی انداز اختیار کیا اور نظم کے کردار ومناظر کو وسیع ترحقیقتوں کا استعارہ بنادیا۔لیکن بعد میں علامتی طریقۂ کار کو نظر انداز کر کے براہِ راست، مکالماتی اور عوامی زبان سے اپنی نظموں کو فکری گہرائی اور جدید اردو نظم کے فن کو ایک نئی جہت عطا کردی۔اختر الایمان نے اپنی نظموں میں، غزل سے مختلف ایک ایسی شعری زبان تخلیق کرنے باقاعدہ کوشش کی ہے جو عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کی ترسیل کے لیے موزوں اور مناسب ہو۔یوں انہوں نے میراجی کی تخلیق زبان کی شعوری کوشش کو ایک نئی سمت ورفتار دینے کی کاوش کی ہے۔واضح رہے کہ میراجی نے ایسی زبان کو رواج دینا چاہا تھا، جو نہ صرف غزل سے مختلف ہو، بلکہ جو ہندوستانی مزاج اور احساس کی بہتر طور پر ترسیل کر سکے۔چنانچہ اختر الایمان کی چند ابتدائی، کلاسیکی لمس والی نظموں سے قطعِ نظر، ان کی بیشتر نظمیں، غزل کی فضا سے بہت مختلف، مکالماتی اور عوامی زبان میں ہیں۔اختر الایمان کی یہ زبان اپنی سہل پسندی کے باوجود، قابلِ ذکر معنوی گہرائی کی حامل ہے۔چند نظموں کی زبان، سہل نگاری سے ایک قدم مزید آگے، کھردری، ناہموار، بلکہ بسا اوقات غیر شاعرانہ ہے۔لیکن زبان کی یہ ناہمواری بالعموم، ان کی نظموں کو بدہیئت اور بدصورت بنانے کے بجائے، جدید اردو نظم کو ایک نئی شعری جہت سے روشناس کراتی ہیں۔بطور مجموعی انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر "جدید اردو نظم" کو فکری عناصر، فلسفیانہ فکر اور احساس کا ترجمان بنادیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. اختر الایمان کی پانچ نظموں کے نام بتائیے۔

8. اختر الایمان کی بیشتر نظموں کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟

15.6 اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا''

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کے مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سِنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت ، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گُم، تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے، خانقاہوں میں
کبھی ہم سِن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مُڑتا
مجھے ایک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے ایک لڑکا، جیسے تُند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں

اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا

تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں

یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

☆☆☆☆☆

15.7 ''ایک لڑکا'' کی تفہیم وتشریح

نظم ''ایک لڑکا'' اختر الایمان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام ''یادیں'' میں شامل ہے۔ یہ نظم اپنی فنی وتکنیکی تکمیل کے علاوہ اس لیے بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ نظم اختر الایمان کی شناخت کا ذریعہ بن گئی۔ اپنی گوناں گوں خصوصیات کی بناء پر زاہدہ زیدی نے اسے اختر الایمان کی ایک تخلیقی جست، فضیل جعفری نے کامیاب ترین اور موثر ترین نظموں میں سے ایک، اور باقر مہدی نے سب سے اچھی نظم قرار دیا ہے۔

لفظ ''لڑکا'' اور اس کی معصومیت سے واضح ہے کہ اس نظم کا عنوان ضمیر یا ضمیرِ انسانیت ہے۔ لیکن موضوع پر بحث کرنے سے قبل بہتر یہ ہے کہ اس نظم کے محرک اور اس کے متعلق اختر الایمان کے بیانات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اختر الایمان اپنے مجموعہ کلام ''یادیں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''نظم ''ایک لڑکا'' پہلی بار میں نے موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی، تصویر کی شکل میں دیکھی تھی، مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی پر لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی، اس لیے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا، اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑ میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں

میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو نہیں روک سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس لڑکے کو میں نے اکثر اپنے گردو پیش پایا۔ یہ لڑکا جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا، مگر جو آزاد تھا یا آزاد رہنا چاہتا تھا، جس کی فطرت اور نیچر دونوں ایک دوسرے سے قریب تھیں۔ جو معصومیت اور ستھرے پن کا علامیہ تھا۔ جو ملوث نہیں تھا کسی کدورت سے بھی۔

وقت کے ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ میں دنیا کی کشمکش میں کھو گیا اور شاعر ہو گیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن میں خیال آیا، میں ایک نظم کہوں جس میں اپنے نام کا استعمال کروں۔............ چونکہ میں نے اپنے آپ کو اس لڑکے سے الگ کر لیا تھا اس لیے میری شخصیت دب گئی، اس لڑکے کی شخصیت ابھر آئی.......... میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا اور ''ایک لڑکا''، ضمیرِ انسانیت کا علامیہ بن گیا۔............ پھر ایک دن، رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرعہ گونج رہا تھا: یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

مجھے معلوم تھا کہ یہ لڑکا کون ہے۔ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی باز پرس کیوں کر رہا ہے؟ مجھ سے میرے اعمال کا حساب کیوں مانگ رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری عمل شروع ہوا۔ معاشرہ کی اخلاقی قدروں میں تضاد، معیشت کے لیے جدوجہد اور قدم قدم پر برائیوں کے ساتھ تعاون، مذہب کی اندرونی اور بیرونی شکل۔ ذہن اپنے اعمال کا حساب دینے لگا اور محتسب یہ لڑکا تھا۔ یہ لڑکا جسے میں برسوں سے جانتا تھا۔ اختر الایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔''

(صفحہ 3، اختر الایمان - پیش لفظ - یادیں)

اختر الایمان کے مذکورہ بالا اقتباس کو ذہن میں رکھ کر نظم کو پڑھیے تو واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ''یاد کا سا

رنگ لیے ہوئے''اس نظم کی ابتدا سوانحی فضا میں ہوتی ہے۔ پہلے بند کے ابتدائی حصے میں ہم نہ صرف نظم کے مرکزی کردار سے متعارف ہو جاتے ہیں، بلکہ اس کے خدوخال کے ساتھ اس کی معصومیت اور فطرت بھی ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔اس حصے میں بچپن کی تصویر کشی، مناظر سے متعلق تفاصیل اور پیشکش میں شاعر نے ایسی فن کاری دکھائی ہے کہ لڑکا ایک متحرک وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور آم کے باغوں میں، کھیتوں کی مینڈوں پر، گلیوں اور میلوں میں گھومتا ہوا، تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتا ہوا اور ادھر ادھر بھٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔

آیئے !اب اس نظم کے شامل نصاب حصے کو مصرعہ بہ مصرعہ آسان زبان میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشرقی علاقوں کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر، کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کے مینڈوں پر، کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں، کبھی چند ادھ ننگے چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف، کبھی صبح سویرے تو کبھی اس وقت جب دن اور رات آپس میں گلے ملتے ہیں تو کبھی راتوں کے اندھیرے میں، کبھی میلوں میں تو کبھی ناٹک کی ٹولیوں اور ان کے ڈیرے میں، کبھی سنسان راستوں پر تتلیوں کے تعاقب میں مصروف، کبھی ننھے پرندوں کے چھپے ہوئے گھونسلوں کی تلاش میں، کبھی ننگے پیر جلتی ہوئی ریت پر تو کبھی بہت زیادہ ٹھنڈی ہواؤں میں، بستیوں، مدرسوں اور خانقاہوں سے دوری اختیار کرنے والا، کبھی ہم عمر خوبصورت بچوں کے درمیان بہت خوش، کبھی ہوا کے بگولوں کے مانند بل کھاتا ہوا تو کبھی اس طرح جیسے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو، کبھی ہوا میں تیرتا ہوا تو کبھی خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا ہوا، کبھی پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا اور بل کھاتا ہوا، ایک آوارہ مزاج آزاد اور سیلانی، جیسے تیز چشموں کا بہتا ہوا تیز پانی۔ مجھے مذکورہ بالا حالات اور خصوصیات کا حامل ایک لڑکا نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ میری جان کی مصیبت ہے، جو مرا ہمزاد ہے جو ہر راستے اور ہر موڑ پر میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہ لڑکا سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ لڑکا اس طرح سے میرا تعاقب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی بھاگا ہوا ملزم ہوں اور مجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟

مختصراً ایک معصوم سا بچہ اپنی تمام تر معصوم حرکتوں، حالتوں اور اندازِ فکر کے ساتھ میرے ساتھ بلکہ میرے

اندر رہتا اور مجھ سے بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟

15.8 خلاصہ

اختر الایمان جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھنے والے ایک اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے نظم کی ہیئت اور موضوع میں طرح طرح کے تجربے کیے۔ موضوعی نقطۂ نظر سے ان کی نظمیں آج کے مسائل کا بھرپور تجزیہ کرتی ہیں اور اسلوبیاتی لحاظ سے ان کی نظموں کی خاص شناخت اور ان کا مخصوص اسلوب مکالماتی اور عوامی لب ولہجہ ہے۔ ان کا یہ اسلوب بسا اوقات کھردرا اور ناہموار محسوس ہوتا ہے تاہم اپنے اندر ایک جہان معانی رکھتا ہے۔

اختر الایمان کے دس مجموعہ کلام ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعہ کلام گرداب 1943ء میں شائع ہوا جبکہ دسواں مجموعہ کلام ''زمستاں سرد مہری کا'' اُن کے انتقال کے بعد 1997ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اُن کی نظم ''ایک لڑکا'' اُن کے مقبول عام شعری مجموعے ''یادیں'' میں شامل ہے۔ اختر الایمان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام ''یادیں'' میں شامل ہے۔ یہ نظم اپنی فنی وتکنیکی تکمیل کے علاوہ اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ نظم اختر الایمان کی شناخت کا ذریعہ بن گئی۔ اس نظم میں اختر الایمان کا ایک ہمزاد تخیلی طور پر سامنے آتا ہے اور اُنہیں بچپن کی یادوں کی طرف لے جاتا ہے' گاؤں کی یادوں کو تازہ کرتا ہے اور بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟ یادوں کے حوالے سے یہ بہت ہی موثر نظم ہے اور اُن لوگوں کو خاص طور پر متاثر کرتی ہے جنہیں آبائی گاؤں یا وطن سے دور ہونے کی تکلیف اُٹھانی پڑی ہو۔

15.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. اختر الایمان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. اختر الایمان کی نظموں کے موضوعات پر چند سطریں لکھیے۔

3. اختر الایمان کے اسلوب پر مختصر سا نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. اختر الایمان کی حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی نظم ''ایک لڑکا'' پر اظہارِ خیال کیجیے۔

2. اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' کا خلاصہ اپنی زبان میں لکھیے اور حوالے کے طور پر نظم کے چند مصرعے بھی تحریر کیجیے۔

15.10 فرہنگ

عسرت	تنگدستی، مفلسی، دشواری		
درپیش	سامنے، روبرو، زیر بحث		
ہنوز	ابھی تک	ظفریابی	کامیابی
مائل بہ ارتقا	ترقی کی طرف مائل، نشونما کی طرف مائل		
حصولِ آسائش	لطف و آرام حاصل کرنا		
پذیرائی	قبولیت، منظوری، استقبال		
زوال	عروج کی ضد، کمی، اتار، تنزل، ترقی اور عروج کا جاتے رہنا		
انحطاط	کم ہونا		
آویزش	لڑائی، فساد، بعد		
تفاوت	فاصلہ، دوری، فرق، جدائی		
ایذارسانی	تکلیف پہچانے کا عمل		
ہمہ جہتی	متعدد سمتوں والا، کثیر الجہت		
آفاقی	ساری دنیا کا، عالمگیر		

حبِ انسانی	انسانی محبت، انسانوں سے محبت
فکری انتشار	ذہنی بکھراؤ، پراگندہ خیالی
صد سالہ	سوسالہ، سوسال کا، ایک صدی کا
ارتقائی	اوپر چڑھنے کا عمل، بتدریج ترقی کرنے کا عمل
جہت	سمت
لمس	کسی چیز کو ہاتھ لگانا
رومانی لمس	رومانی انداز
انفرادیت	ذاتی خصوصیت، فرد کا الگ وجود
اجتماعیت	ایک جگہ اکٹھا ہونا، عوامی
خارجیت	مادی، ظاہری، بیرونی سے متعلق
داخلیت	باطنی، اندرونی سے متعلق
کلاسیکیت	مستند، قدیم، ادب عالیہ

رومانی : رومانیت، لفظ رومان سے مشتق ہے۔لیکن بحیثیت اصطلاح، حتمی طور پر اس کی تعریف متعین کرنا، قدرے دشوار گزار عمل ہے۔کیوں کہ مشرق ومغرب کے بیشتر مفکرین کے آراء اس معاملے میں مختلف ہیں۔اسی لیے آل احمد سرور نے اسے ''بت ہزار شیوہ'' کہا ہے جس کے ان گنت روپ ہیں۔ابتداءً اس کا اطلاق حسن وعشق کی آراستہ و پیراستہ، پرشکوہ کہانیوں پر ہوتا تھا۔پروفیسر احتشام حسین کے نزدیک رومان کا مطلب حسن وعشق کا افلاطونی وتخیلی بیان نہیں بلکہ روایت سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، ان دیکھے حسن کی جستجو، وفورِ تخیل، خوابوں اور خیالوں سے محبت، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادی خیال، حسن سے لطف اندوز ہونے میں نا آسودگی کا احساس اور اس کا کرب وغیرہ ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق ''رومانیت اصول پرستی، عقلیت اور میانہ روی کے خلاف صاعقہ بردوش بغاوت ہے''۔

مختصراً احساس، وجدان اور جذبہ رومانیت کے بنیادی عناصر ہیں۔

علامیہ، علامت : لفظ علامت ''نشان'' سے مختلف ہے۔کوئی ایسی چیز جو کسی دوسری شئے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جیسے صلیب عیسائیت کی اور ہتھوڑا اور درانتی کمیونزم کی علامتیں ہیں۔ادب میں پیچیدہ علامتوں کا استعمال ہوتا ہے، جن کو کسی بھی علم سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

سیزوفرینیا : سیزوفرینیا (Schizophrenia) ایک طرح کی ذہنی ونفسیاتی بیماری ہے۔ اس کی بنیادی شناخت، عادات واطوار، فکر وخیال، زبان اور فہم میں پیدا ہو جانے والا ایک عجیب سا سنکی پن ہے۔اس مرض میں مبتلا لوگوں میں عام طور پر، مردم بےزاری کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور وہ معاشرے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں، نیز عموماً ایک طرح کی بے چینی کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ داخلی (Interovert) ہو جانے کی وجہ سے ان کے اندر بے معنی، مہمل، غیر موثر اور مجہول زندگی گزارنے کا رجحان زور پکڑ لیتا ہے۔اس کی تشخیصی علامتیں ہیں: ذرائع آگہی و ادراک میں سہو کا دخل اور اس کی ابتر حالت (Cognitive slippage and derailment)، فریب نظر اور فریب تصور (Hallucination) یعنی ایسا سمعی یا بصری تصور یا خیال جس کا کوئی بیرونی جواز نہ ہو (واضح رہے کہ یہ فریب نظر یا فریب تصور، التباس یعنی Illusion سے قدرے مختلف ہوتا ہے) اور توہم پرستی یا اختباط (Delusion) وغیرہ ہے۔

عضویاتی وحدت	تمام اجزا وعضو کامل کر ایک ہو جانا
اشتراکی	سوشلزم سے متعلق، مارکسی نظریے سے متعلق
نامیاتی ارتقا	کسی فن پارے یا خیال کا فطری ارتقا
دیار	علاقہ
شرق	مشرق، پورب
نیم عریاں	آدھے ننگے

سحردم	صبح کے وقت
جھٹپٹے کے وقت	اس وقت جب دن اور رات دونوں ملتے ہیں
نہفتہ	پوشیدہ، خفیہ، چھپا ہوا
خواب گاہ	سونے کی جگہ، آرام کرنے کی جگہ
یخ بستہ	ٹھنڈ سے برف کی طرح جما ہوا، بہت زیادہ ٹھنڈا
گریزاں	متنفر، بھاگنے والا
جیوں	جیسے، مانند
خوں بستہ	خون رکا ہوا
منش	طبیعت، عادت
سیلانی	گھومنے پھرنے والا
بلائے جاں	جان کی مصیبت
گام	راستہ
ہمزاد	جو ساتھ پیدا ہوا ہو، جڑواں، وہ روایتی شیطان یا جن جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔
جولاں	کود پھاند کرتا ہوا، حرکت کرتا ہوا
محرک	تحریک پیدا کرنے والا، بلانے والا، اکسانے والا، ابھارنے والا
محتسب	حساب لینے والا، کوتوال
متعارف ہونا	آپس میں جان پہچان حاصل کرنا

15.11 معاون کتابیں

1. اختر الایمان ایک مطالعہ : آصف زہری
2. یادیں (مجموعہ کلام) : اختر الایمان

15.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اختر الایمان 12 نومبر 1915ء کو اتر پردیش کے ضلع بجنور کے قصبہ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔
2. اختر الایمان کو یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، میر اکادمی، نے انعامات اور حکومت مدھیہ پردیش نے ''اقبال سمان'' سے نوازا۔
3. فلم فیئر ایوارڈ
4. یادیں
5. زمستاں سرد مہری کا
6. اختر الایمان کی خودنوشت 1996ء میں ''اس آباد خرابے میں'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی۔
7. تاریک سیارہ' خاک وخون' محبت' ایک لڑکا' مفاہمت
8. انسان دوستی